مخالفتِ قریش اور دعوت نبوی کا ارتقا

ڈاکٹر نثار احمد

(۱)

اس سلسلے کے گزشتہ مضامین میں ہم مخالفت قریش کی نوعیت، اسباب، احوال، تاریخ کا پہلا مرحلہ زیر بحث لا چکے ہیں۔ اور آغاز وحی و رسالت سے ہجرت مدینہ تک یعنی ابتدائی ۱۳ سالہ مکی دور ۶۱۰ء تا ۶۲۲ء کا مجموعی جائزہ پیش کر چکے ہیں۔ یہ عرصہ قریش کی بھرپور قیادت و سیاست کا زمانہ تھا۔ شہری مملکتِ مکے کے مناصب پر موروثی اختیار، قوت و طاقت کے وسائل پر قبضہ، پورے معاشرے پر حاکمانہ اثر و رسوخ انہیں حاصل تھا۔ تجارت و کاروبار پر بھی قریش حاوی تھے۔ نیز خانۂ کعبہ کی مجاورت کی ذمے داری اور منفعت میں حصے داری کے سبب آمدنی کے ساتھ ساتھ عرب کے اندر اور عرب سے باہر بھی قریش کی عزت و توقیر کی جاتی تھی اور ان کا احترام و اعتبار قائم تھا۔

ایسے ماحول اور معاشرے میں قبیلۂ قریش کے ایک معزز خاندان بنو ہاشم میں سے حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ کا ظہور، اور اپنی چالیس سالہ مثالی زندگی ان ہی کے درمیان گزارنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نبوت و رسالت سے مشرف ہونا پھر اوّلاً اپنی قوم، اپنے ہم وطنوں کو اسلام کے عالمی پیغامِ جانفزا کا متحمل بنانا چند در چند وجوہ سے وجۂ نزاع بن گیا۔ جس کا گزشتہ فصول میں اسباب کے تحت جائزہ لیا جا چکا ہے اور یہ دیکھا جا چکا ہے کہ اسلام کے پیغامِ حیات آفرین کی مخالفت اور جناب ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ سے عداوت کے باب میں قریش نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ نیز زبانی عملی، انفرادی اجتماعی، ہر طرح ہر سطح پر دعوتِ محمدی کو روکنے ٹوکنے اور اس کی راہ کھوٹی کرنے میں قریش نے اپنا سب کچھ لگا دیا اور جو تدبیر و ترکیب ممکن تھی اسے روبہ عمل لانے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بنا بریں قریش کی طرف سے ظلم و تعدی اور تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا۔ نیز اس کا نشانہ اہل ایمان کو ہی نہیں بنایا گیا بلکہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اُس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔

۱۳ سالہ مکی دور کے حوالے سے دو باتیں گویا مسلمات میں داخل ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں/اہل ایمان پر قریش کی طرف سے ہر قسم کے مظالم برابر ڈھائے جاتے رہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ دعوت اسلامی کو پھیلنے سے روکا جائے اور اہل اسلام کی زندگی اجیرن کر دی جائے۔ دوسرے یہ کہ قریش مکہ کی تمام تر مخالفانہ و معاندانہ کوششوں کے باوجود مسلمانوں نے بے مثال صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور دعوت اسلامی کے فروغ، توسیع اور ترقی کا سلسلہ برابر آگے بڑھتا چلا گیا۔

چنانچہ تاریخ کی روشنی میں یہ صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ ابتدائی تین سالوں کی خفیہ دعوت کے نتیجے میں کم از کم مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات میں ہی پیغام ربانی پر ایمان لانے والوں کی مجموعی تعداد سو سے کہیں زیادہ متجاوز ہو گئی (۱) پھر اگلے تین سالوں میں اس کے پھیلاؤ میں مزید اضافہ ہوا اور علانیہ طور پر دعوت محمدی کی شہرت مکہ مکرمہ سے نکل کر آس پاس کے علاقوں تک پہنچ گئی۔ انفرادی طور پر بھی آواز حق سننے اور اور داعئ برحق سے ملنے کا تجسس لوگوں کو دور دراز سے کھینچ کر دامن اسلام میں لے آیا۔ مثلاً طفیل دوسی کو نواح یمن سے، ابوذر غفاری کو یثرب سے، ضماد الازدی کو یمن سے، اور تمیم و لخیم و دیگر کو شام وغیرہ سے۔ دوسری طرف اجتماعی طور پر ہجرت حبشہ اوّل رجب ۵ نبوی اور چند ماہ بعد ۶ نبوی میں ہجرت حبشہ دوم کی صورت میں مکہ کے بہت سے اہل ایمان کو مکہ مکرمہ سے نکل کر بیرون ملک حبشہ چلے جانے کا موقع ملا (۲) ان تمام ہجرت کرنے والوں میں سے اگرچہ ۳۳/۳۴ نے وہاں چند ماہ قیام کے بعد واپسی کا فیصلہ کیا لیکن بقیہ کثیر تعداد نے وہاں ۱۵ سال قیام و سکونت اختیار کر کے اپنی دعوت و کردار سے باشندوں میں ایک بڑا حلقۂ اثر قائم کر لیا۔ یہاں تک کہ بقول مولانا محمد سلیمان، سلمان منصور پوری حبشہ کے بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔ (۳)

قیام مکہ مکرمہ کے آئندہ ۶/۷ سالوں کے دوران بھی متذکرہ بالا دونوں خصوصیات (قریش کے مظالم کی انتہا اور توسیع و ترقی اسلام) نمایاں تر ہوتی چلی گئیں۔ چنانچہ مظالم قریش کے حوالہ سے انتہائی ظالمانہ اقدام وہ معاشی و معاشرتی مقاطعہ قابل ذکر ہے۔ جس کے تحت تین سال تک بطور خاص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حمایتی قبیلے اور خاندانوں کو مشق ستم بنایا گیا۔ تاہم نہ خاندان کے کسی فرد کے پائے استقلال میں لغزش پیدا ہوئی نہ قریش کو اپنے مقاصد میں ذرہ برابر کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے برعکس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی حلقہ اور وسیع ہو گیا۔ آپ کا پیغمبرانہ کام جو مقامی شہری ملکی سطح سے شروع ہوا تھا اور ہجرت حبشہ (۵، ۶ نبوی) کے بعد بین الاقوامی نوعیت اختیار کر گیا۔

(۲)

دعوت نبوی نے ہجرت حبشہ اوّل و دوم کی صورت میں جو بین الاقوامی نوعیت اختیار کر لی تھی۔ اگلے تین سالوں میں (۷ تا ۱۰ نبوی) درجہ بہ درجہ عالمی آفاقی شکل میں نمایاں ہوتی چلی گئی۔ ان تین سالوں میں بھی خصوصاً نبوت کا دسواں سال، جہت سازی، اور توسیع عداوت قریش اور ترقیٔ دین اسلام کے لحاظ سے اہم ترین قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ نشاندہی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ منٹگمری واٹ نے اپنی کتاب محمد ایٹ مکہ میں دور زیر بحث کو توسیع دے کر ہجرت تک کے موضوعات کو (باب ششم میں) Expanding Horizons (پھیلتے افق) کے زیر عنوان بیان کر کے بڑی حد تک معنی خیز بنا دیا ہے۔ (۴) اس اجمال کی تفصیل اگلے صفحات میں نکات کی صورت میں دی جا رہی ہے۔

۱۔ محرم ۷ نبوی تا محرم ۱۰ نبوی کا وہ تین سالہ زمانہ جس میں قریش مکے کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، بنو ہاشم و بنو مطلب کا معاشرتی و معاشی مقاطعہ کیا گیا، ظاہر کر رہا تھا کہ دعوتی کام مقامی اور شہری سطح پر نقطۂ سیری (Saturation Point) تک پہنچ گیا ہے۔ وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی! جس کی نو دس سالہ شبانہ روز مخلصانہ کوششوں کے سبب وہ آبشارِ دعوت پھوٹ نکلا جس نے پیرا ہن ہدایت رکھنے والے ہر متنفس کو تر بہ تر اور شرابور کر دیا تھا۔ آدمی کے اندر باطن میں بھی زمین ہوتی ہے، بنجر، چٹیل، شور، یا نرم، زرخیز گداز۔ فطرت کے عام قاعدے سے یہ بھی مستثنیٰ نہیں ہوتی

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شور بوم و خس

چنانچہ بدیہی طور پر سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عرصۂ نبوت میں اپنی توجہ بطور خاص بیرونِ مکہ منعطف فرمائی۔ طائف کا تبلیغی سفر، اور موسمِ حج میں حجاج و زائرین کی خیمہ گاہوں میں، مضافاتِ مکہ کے قبائل میں، عکاظ، ذالمجاز، مجنہ کے میلوں، بازاروں میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مساعیِ تبلیغ، (مخالفت میں قریش کی منفی کوششیں) یہ سرگرمیاں، انجام کار ثمر بار ثابت ہوئیں، دعوت اسلامی کا رخ بدلا اور اس کی توسیع و ترقی کے نئے مناظر سامنے آتے چلے گئے۔ اس کے حوالے اور کچھ تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔ ایک جدید العہد مسلمان سیرت نگار کا آئندہ مناظر کے لئے The Tide Turns کا تجویز کردہ عنوان پیش منظر کی وضاحت کر رہا ہے۔ (۵)

۲۔ اسی دسویں سال نبوت (محرم) میں قریشی مقاطعہ کا اختتام ہوا۔ جو بوجوہ صرف تین سال تک

جاری رہ سکا۔ یہی سال عام الحزن کہلایا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پے در پے صدمات سے دوچار ہونا پڑا، جناب ابو طالب جیسے کفیل وحمایتی، سربراہِ خاندان کا انتقال (رجب ۱۰ نبوی) ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا جیسی ہم دم، ہم قدم معاون، غم خوار، رفیقۂ حیات کا وصال (رمضان ۱۰ نبوی) اور ابن رسول (حضرت عبداللہ جن کا لقب طیب وطاہر ہے) کا انتقال (۶) بڑے صاحب زادے حضرت قاسم کا انتقال پہلے ہی کم سنی میں ہو چکا تھا۔ بادی النظر میں یہ حادثات قریش کی مسرتوں میں اضافے کا باعث تھے۔ (۷) چنانچہ ان کی طرف سے کی جانے والی متعدد جسارتیں ان کو اذیت واہانت رسول کریم کے بارے میں بے باک بنا رہی تھیں۔ اور ہیکل نے صحیح لکھا ہے کہ (ان اندوہناک واقعات کے بعد ہی) قریش بے لگام ہو گئے۔ (۸) یہ گویا توسیع عداوتِ قریش کا زمانہ تھا، جو اپنے تئیں اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان آفات وحوادث کے نتیجے میں آفتابِ رسالت مآب کی روشنی خود ہی ماند پڑ جائے گی، اولوالعزمی پست ہمتی میں بدل جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی ومنصبی حیثیتِ نفسی ونفسیاتی حالت زوال آشنا ہو جائے گی اور آپ کی برپا کردہ تحریک کا زور ٹوٹ جائے گا۔ لیکن چشم فلک نے دیکھا کہ قریش کے اندازے غلط ٹھہرے، ان کی خواہشیں، آرزوئیں، تمنائیں بے توقیر ہوئیں، بلکہ ان اندوہناک واقعات و حوادث نے داعیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری مادّی سہاروں سے بے نیاز کر کے ہمت وجرأت، صبر ثبات، توکل واعتماد علی اللہ، اور تحمل وبرداشت کی صفات عالیہ سے بہرہ مند کر دیا اور راہِ حق میں پیش قدمی کے لئے عزم وحوصلہ کی لازوال دولت عطا کر کے انہیں اور بہادر بنا دیا۔ اتنا بہادر کہ درج بالا صدمات و حوادث کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ محض اپنے خادم ووفادار زید بن حارثہؓ کے ساتھ طائف کے دشوار تبلیغی سفر پر پا پیادہ نکل کھڑے ہوئے۔ (۹) یہ سفر طائف بھی عام الحزن کے عرصے میں شامل ہے۔

۳۔ ہمارے ہاں عام طور پر طائف کے طبعی جغرافیائی حالات وکوائف اور احوالِ سفر طائف پر تو بہ خوبی روشنی ڈالی گئی ہے (۱۰) لیکن سیرت کے باب میں اس سفر طائف کی نوعیت واہمیت سے بحث نہیں کی گئی اور بطور خاص توسیع مخالفت وعداوت قریش اور اس کے بالمقابل ترقی دعوتِ اسلام کو بالکل نمایاں نہیں کیا گیا۔ بلکہ پورے واقعات کو اس طرح سے زیادہ تر پیش کیا گیا کہ سفر طائف محض مرقع مظلومیت نظر آتا ہے اور یہ تاثر ابھرتا ہے کہ حضور رسالت مآب ﷺ وہاں جانے کی زحمت ہی نہ فرماتے تو بہتر تھا۔

سفر طائف کو ذرا امعانِ نظر سے دیکھئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف نہ لے جاتے تو تقاضائے رسالت پورا نہ ہوتا۔ اتمام حجت نہ ہو پاتی، ابلاغ حق کا کمال ادھورا رہ جاتا، طائف کی پوری بستی، اور اس سے ملحق آبادیاں اور ان کی آئندہ آنے والی نسلیں نورِ ہدایت سے محروم ہو جاتیں لِتُنْذِرَ اُمَّ

الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (۱۱) کی تعبیر مکمل نہ ہوسکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ علیہ وسلم کی ولادت مطہرہ اور بعثت مبارکہ مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی، فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ O (۱۲) اور فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (۱۳) کی منزلوں سے گزرتے ہوئے، شہر مکہ کے در و بام، بلد امین کے کوچہ و بازار، دعوتِ توحید کا آوازہ سن چکے، اس کے عوام و خواص تک پیغامِ رسالت پہنچ گیا، جن کو یہ قبول تھا وہ آتے گئے اور دامنِ رسالت پناہ سے جڑتے گئے۔ لیکن جو مخالف تھے محروم ہدایت رہے، خصوصاً قریشی سرداروں، مال داروں، حب جاہ و مال کے پرستاروں نے اپنے غرور و تکبر، رعونت اور فرعونیت سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ نہ دعوتِ حق کو مانتے ہیں نہ داعی حق کو، نہ کلام الٰہی کو نہ قرآن کو، بلکہ وہ ان سب کے آگے رکاوٹ بن گئے، مٹانے کے درپے ہوگئے۔ حالانکہ وہ ہم وطن، ہم زبان، ہم قبیلہ، رشتہ دار و قرابت سبھی کچھ تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اب قریش مکہ کے لئے اپنی ساری توانیاں صرف کرنے سے بہتر ہے کہ نئے مواقع، نئی زمین اور نئے مخاطبین کو تلاش کیا جائے۔ اس سلسلے میں ترجیحی طور پر مکہ مکرمہ کے بعد ابلاغ حق اور اتمام حجت کے لئے طائف وثقیف کا رُخ اختیار فرمانا عین صواب تھا۔ اس کے کئی رُخ کئی زاویئے ہیں:

۱۔ طائف کو زمانۂ قدیم سے مکہ کا جڑواں شہر سمجھا جاتا تھا۔ طائف مکہ کا ثنی، اس کا ہم پلہ، اس کا مدمقابل تھا، بعض انفرادی خصوصیات و امتیازات اور آب و ہوا، موسم محل وقوع وغیرہ کے فرق کے باوجود دونوں شہروں میں بہت کچھ مماثلت و مشابہت بھی پائی جاتی تھی۔ مثلاً کعبہ/عزیٰ/ہبل مکہ مکرمہ میں، طائف میں بت خانہ لات، مکے کا طاقتور قبیلہ قریش، طائف کا بنوثقیف، دونوں شہروں میں سرداروں، مالداروں، امرا، رؤسا کے بالا دست طبقات تھے اور عوام الناس پر ان کی گرفت یکساں تھی، صاحبان ثروت و دولت کی عیاشیاں، ان کی سماجی ثقافتی حالت اور اخلاقی نفسیاتی بیماریاں یک ساں یعنی حب دنیا، حب جاہ و مال، شیخی، زعم باطل، فکر و غرور، طاقت کے نشے میں دوسروں کی تحقیر و تذلیل کا شوق، عزت و عظمت کی دلیل اور معیار صرف دولتِ دنیا اور وسائل حیات کی فراوانی۔ وغیرہ، وغیرہ واٹ نے سفر طائف کے بیان میں پہلا جملہ ہی یہ لکھا ہے کہ ''بعض اعتبار سے طائف مکے کا ہی چربہ اور نقل، نقش ثانی اور مقابل و مماثل (Replica) تھا۔'' (۱۴) قرآن نے بھی مکہ اور طائف دونوں شہروں اور بستیوں کے ذکر و تعارف کے لئے صرف ایک ہی لفظ قَرْيَتَيْن استعمال کیا ہے۔ (۱۵) چنانچہ سورۃ الزخرف میں ارشاد فرمایا گیا کہ دعوتِ حق کے جواب اور پیغام قرآنی کے رد میں قریش مکہ کے امرا اور رؤسا نے کہا کہ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ O ''انھوں نے کہا کہ یہ قرآن (اگر نازل ہی کیا جانا تھا) تو ان دونوں شہروں/بستیوں (مکہ/طائف) کے کسی بڑے شخص پر کیوں نہ نازل کیا گیا'' (۱۶)۔ اس میں یہ

ظاہر تو کفار و مشرکین مکہ کا ایک قول ہی نقل کیا گیا ہے لیکن بہ باطن مکہ اور طائف کے اہل ثروت امراو رؤسا کے یکساں منفی رویہ کی نشاندہی کی گئی جو دولت کے غرور، سرداری کے گھمنڈ، اور طاقت کے نشے میں چور صرف دولت مندوں کو ہی اہمیت دیتے ہیں اور ان کے نزدیک صاحب مال، جاہ پسند ہی بڑا کہلائے جانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ اور ان کی نظر میں نبوت و رسالت اگر واقعی باعث عزت و عظمت ہے تو مکے میں ولید بن المغیرہ جیسا شخص یا طائف میں عروہ بن مسعود الثقفی جیسا شخص ہی اس کا اہل ہوسکتا ہے۔ قرآن میں اس تفصیل سے بجا طور پر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ محل وقوع کے فرق کے باوجود قرآن میں مکہ اور طائف کو ''القریتین'' سے تعبیر کرنا، ایک دوسرے کا مثنّٰی قرار دینا، تلازم مکانی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس اعتبار سے مکہ مکرمہ میں دعوت اسلام اور ابلاغ حق کو اتمام حجت کی منزل تک پہنچانے کے لئے ضروری تھا کہ طائف کے طبقہ اشراف تک توحید ربانی اور پیغام قرآنی پہنچایا جائے۔ شاید اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی انتظار و اہتمام کے بغیر ہی حضرت زید بن حارثہ کی معیت میں سفر طائف پر روانہ ہوگئے۔

ب۔ مکہ اور طائف کے دونوں شہروں میں باشندوں کی آمد و رفت اور ان کے تجارتی و سماجی روابط نے ایک دوسرے سے قربت کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق ''اگر ایک طرف مال دار اہل مکہ، بالخصوص بنو امیہ طائف میں زمینیں خریدنے اور گرمیاں گزارنے آیا کرتے تھے تو طائف کے مستعد باشندے بھی تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں مکہ میں بود و باش رکھتے تھے۔'' (۱۷) مزید برآں خاندانِ بنو ہاشم کی طائف میں رشتہ داریاں تھیں۔ بنو عبدۂ یالیل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموؤں کا خاندان کہا جاتا ہے۔ ابولہب کی بیٹیوں کی اہل طائف سے شادیاں ہوئی تھیں حضرت عباسؓ کا بھی طائف سے رقمی اور تجارتی کاروبار بہت تھا اسی لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہم وطنان مکہ سے مایوس ہوئے تو انہوں نے اپنے ماموؤں کا رخ کیا۔'' (۱۸) [ماموؤں کا یہ خاندان جیسا کہ واٹ تصریح کرتا ہے قریش کے ڈھب کا اور ان ہی سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا، کیونکہ طائف میں بطور خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اشراف تک رسائی حاصل کی تھی یعنی عبد یالیل اور اس کے بھائی ان کا تعلق عمرو بن عمیر کے خاندان سے تھا اور وہ اس احلاف میں شامل تھے۔ اس کے بقول طائف میں مرکزی طور پر دو سیاسی گروہ تھے ایک بنو مالک اور دوسرے الاحلاف۔ موخر الذکر طائف میں عرصۂ دراز سے مقیم تھے اور وہ مقدس دیوی لات کے مجاور و محافظ تھے اس لئے انہیں عوام الناس قرار دینا گمراہ کن ہے۔ بنو مالک بنو ہوزان سے گہرے طور پر متعلق تھے جو ملحقہ علاقے پر تسلط رکھتے تھے، جبکہ احلاف اس کا جوابی توازن کا درجہ رکھتے تھے اور قریش کی حمایت رکھتے تھے۔ وہ یہ بھی وضاحت کرتا ہے کہ

مجموعی طور پر بنوثقیف قریش سے کم طاقتور تھے تاہم حرب فجار اوّل کے نتیجے میں انہوں نے یہ منوالیا تھا کہ وہ مالیاتی طور پر قریش پر بالادستی و برتری رکھتے ہیں۔(۱۹)

مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان سماجی و معاشی روابط کے نتیجے میں یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ طائف اور اہل طائف حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی دعوت اور تحریک سے پوری طرح متعارف تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے تبلیغی مشن کی شہرت ان تک پہنچ چکی تھی چنانچہ جب طائف پہنچ کر آپ سردارانِ بنوثقیف سے ملے (جو ان کے ماموں بھی تھے) تو قریشی سرداروں کی طرح یکساں کردار و شخصیت رکھتے ہوئے انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منفی روّیہ اختیار کیا آپ کی تحقیر کی، اور ہر پاس ولحاظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آپ کی دعوت کو رَد کر دیا۔(۲۰)

۶۔ بہرحال جن ذاتی و دعوتی حالات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا سفر اختیار فرمایا ہمارے نزدیک اس کا مقصد اس خطے میں ابلاغ دعوتِ حق کی تکمیل اور اتمام حجت تھا۔ قریشِ مکہ سے ڈر کر یا مظالمِ کفار یا حوادث زمانہ سے پریشان ہو کر کسی پناہ گاہ یا جوار کی تلاش میں، یا کسی اور ذاتی منفعت کے حصول کے لئے نہیں گئے تھے۔ ڈاکٹر زکریا نے لکھا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی دعوت وعقیدے کے لئے ایک نیا مرکز قائم کرنے کی غرض سے طائف جانے کا فیصلہ ''بہت جرأت مندانہ اور مثبت قدم تھا۔''(۲۱) واٹ کے مطابق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پہلی ترجیح، بادی النظر میں یہ تھی کہ اسلام کے لئے نئے ایمان لانے والے میسّر آجائیں۔ وہ اس روایتی بیان کی کہ جناب ابوطالب کی وفات کے بعد وہ کسی محافظ وحمایتی کی تلاش میں گئے تھے تائید نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک صرف یہی مقصد نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ یہ بھی خیال ظاہر کرتا ہے کہ آپ اس امید پر گئے ہوں گے کہ وہاں ایک اسلامی معاشرے کی داغ بیل ڈال سکیں جیسا کہ بعد میں مدینے میں ہوا۔ اس کے نزدیک اس امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ آپ ﷺ اپنے حمایتی پیدا کر کے مکہ کے کفار قریش کے لئے مشکلات پیدا کر دیں اور اپنے آدمیوں کو وہاں سے نکال لے جائیں۔ وہ اس عجیب وغریب امکان کے لئے بے یقینی ظاہر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس بارے میں کچھ اختلاف یقیناً کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ طائف کی سیاست کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔(۲۲) بعض دیگر قدیم وجدید مصنفین نے بھی سفر طائف کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے (۲۳) اپنی نوعیت وحقیقت میں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ خالصتاً تبلیغی سفر تھا، اور تمام تر خطرات وامکانات یا خدشات کے باوجود توسیع دعوتِ اسلام کی غرض سے تھا۔ اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

۷۔ سفر طائف کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی، وہاں قیام، تبلیغی مصروفیات اور واپسی میں

کتنا عرصہ لگا اور ان تمام مراحل کی مدت وقوع کیا تھی؟ یہ امور غور طلب ہیں۔ ظاہر ہے یہ دو چار دن کی بات نہیں۔ ہفتوں (کم از کم دس دن) یا مہینوں (کم از کم ایک ماہ) پر پھیلے ہوئے واقعات ہیں۔ اور ان سے پہلے اور بعد کے معاملات کا باہمی ارتباط و تسلسل صحیح صورت حال کو سامنے لاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا قاضی سلمان منصور پوری نے ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغ کے لئے مختلف قبائل کی جانب سفر کرنا'' کا عنوان قائم کر کے جو تفصیل دی ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر طائف بھی تبلیغی تسلسل کا حصہ تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''نبی صلعم نے اب زیادہ جوش سے وعظ کا کام شروع کر دیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں بعد مکہ سے نکلے اور بیرون جات کو وعظ کے لئے تشریف لے گئے۔ نبی ﷺ کے ساتھ اس سفر میں زید بن حارثہ تھے۔ مکہ اور طائف کے درمیان جتنے قبیلے تھے سب کو وعظ سناتے، توحید کی منادی کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیادہ پا طائف پہنچے، طائف میں بنوثقیف آباد تھے۔ (۲۴) ایک جدید العہد مصنف کا یہ بیان بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ ''آپ وہاں کے لوگوں کو اسلام اور توحید کی دعوت دینے تشریف لے گئے تھے کیونکہ آپؐ جانتے تھے کہ اگر طائف میں چند لوگ بھی مسلمان ہو گئے تو پھر وہاں توحید کی روشنی کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکے گا اور وہاں پر بھی مسلمانوں کی ایک جماعت پیدا ہو جائے گی۔ آپ توحید کی دعوت امیروں کو بھی دیتے تھے غریبوں کو بھی اور آزاد افراد اور قبائل کے سرداروں کو بھی، طائف میں بھی آپ ﷺ نے سب طبقوں کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ لیکن چونکہ آپ کو وہاں پر جو حادثہ پیش آیا وہ آپؐ کے سرداروں کو اسلام کی دعوت دینے کے نتیجہ میں اور ان کے ردِّ عمل کی وجہ سے پیش آیا تھا اس لئے سب نے اس کا ذکر کیا اور وہی باقی حالات پر غالب آ گیا (۲۵)۔ پیر کرم شاہ الازہری نے سفر طائف کی تفصیل میں لکھا ہے۔ ''یہاں پہنچ کر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رابطہ مہم شروع فرمائی، تمام قابل ذکر افراد کے پاس تشریف لے گئے۔'' مزید یہ کہ ''گھر گھر جا کر اسلام کی دعوت دینے کا یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا'' (۲۶) بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح طائف میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھا اس کا تقاضہ یہی ہے کہ طائف میں آپ کا قیام چند روز سے یقیناً زیادہ تسلیم کیا جائے۔ افسوس یہ ہے کہ تمام عربی مآخذ سیرت و تاریخ اور اردو تصنیفات اس بارے میں خاموش ہیں کہ حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام کہاں رہا؟ حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف اور اہل طائف کے لئے بالکل اجنبی نہ تھے۔ وہاں بنو ہاشم اور دوسرے لوگوں کی رشتہ داریاں تھیں، بنوثقیف ان کے ماموؤں کا گھرانہ تھا، طائف میں حضور کے دادا عبدالمطلب کی جدی پشتی جائدادیں تھیں (۲۷) قریش کے دوسرے گھرانوں کی بھی رشتے داریاں تھیں۔ تینوں سردارانِ بنوثقیف (عبد یالیل، مسعود، حبیب) میں سے ایک

کی شادی قریشی قبیلہ بنو جمح میں ہوئی تھی۔ ماخذ اس بارے میں بھی خاموش ہیں کہ گستاخ بے مروّت سردارانِ بنو ثقیف کے انکار و استرداد کے بعد جب آوارہ گردوں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کیا اور سنگ باری کی تو ہجوم عوام میں سے جو دور و یہ کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ (۲۸) کوئی ایک متنفس بھی ایسا نہ نکلا جس کا دل پسیجتا یا جو آگے بڑھتا دل جوئی کرتا یا ان پتھر بازوں کو روکتا؟ عتبہ شیبہ جیسے کافروں کے دلوں میں رحم آجاتا ہے۔ (۲۹) لیکن وہاں موجود عام لوگوں کے دلوں میں کوئی جذبہ نہ ابھرا۔ ان هذا لشیء عجاب

بہر حال یہ خاص بات ہے کہ سردارانِ بنو ثقیف کی بدسلوکی اور طائف کے قائدین و عوام کے حد درجہ منفی روّیے کے باوجود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ مایوسی طاری ہوئی نہ دل شکستگی، نہ شکوہ شکایت، نہ آسائش استراحت کی تمنا، نہ استمداد غیر اللہ کا خیال آیا، نہ کسی بدلے انتقام کا داعیہ پیدا ہوا، نہ مقصدِ سفر ترک کیا، نہ سعی دعوت سے گریز فرمایا، ہر گز رنے والا لمحہ ہادی عالم کے صبر و ثبات، توکل، رجوع الی اللہ میں اضافہ کرتا چلا گیا یہاں تک کہ جذبات سے لبریز وہ دعالب ہائے مبارک پہ رواں ہوگئی (۳۰)۔ جس کے پہلے ہی فقرے میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا: ''اے اللہ! اپنی کمزوری بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں'' یہ بھی فرمایا کہ: ''الٰہی اگر تیری ناراضی مجھ پر نہیں تو پھر کسی کی کیا پرواہ؟ تیری عافیت و پناہ کی وسعتیں میرے لئے کافی ہیں، میں تیری ذات کے نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دین و دنیا کے تمام کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔'' بہر حال طائف کے بازاروں میں آپ ﷺ پر جو سخت ترین مقام آیا تھا گزر چکا تھا۔ (۳۱)

• اہل طائف پر اپنی بہترین کوششوں کے ساتھ، ابلاغ حق کے بعد گویا اتمام حجت ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ واپس سفر شروع فرمایا۔ اثنائے راہ میں قرن الثعالب کے مقام پر پہنچے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ملک الجبال کے ہمراہ نزول فرمایا اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوئے: اللہ نے وہ سب کچھ سن لیا ہے جو آپ کی قوم (طائف) نے آپ کی دعوت کے جواب میں کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے کو میرے ہمراہ بھیجا ہے آپ اسے جو حکم دیں گے وہ ویسا ہی کرے گا'' (۳۲) یہ اہل طائف کی بدسلوکی پر بدلہ چکانے کا مناسب موقع تھا، مگر جو مرتبہ رحمۃ للعالمینی پر فائز تھا، اس سید و سرور نے خود ملک الجبال کو یہ فرما کر حیران کر دیا کہ: ''امید ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں ضرور ایک اللہ کی عبادت کرنے والی ہوں گی''۔ (۳۳) چند لمحوں میں یہ کتنا بڑا فیصلہ تھا جو آئندہ زمانوں پر محیط ہو گیا۔ ظالم جابر، مغرور سرکش، موذی اہل طائف کے لئے رحم و درگزر، ان کی نسلوں کے لئے نیک تمنائیں، ایسی تعمیری سوچ کی آئینہ دار تھیں، جو فروغِ دین کی نئی جہات کو سامنے لانے کا باعث ہوئیں۔ چنانچہ واپسی سفر

میں مکہ مکرمہ سے ایک رات کے فاصلے پر مقام بطن نخلہ ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (کئی دن) قیام فرمایا (۳۴) اسی دوران ایک رات نماز میں لب ہائے مصطفوی سے تلاوت قرآن سن کر جنوں کی غیر مرئی مخلوق نہ صرف یہ کہ ایمان لے آئی بلکہ ان ہی میں سے ایک جماعت خود اپنی قوم اجتہ میں دعوت الی اللہ پھیلانے میں لگ گئی۔ (۳۵)

۴۔ جنوں کے ایمان لانے کے اس واقعہ سے گویا تبلیغ اسلام کا ایک نیا در کھل گیا۔ اور یہ ظاہر ہو گیا کہ جو پیغمبرانہ دعوت مکہ مکرمہ سے ابھری تھی چند سالوں میں ہی آفاقی نوعیت اختیار کر گئی ہے اور اس نے مخلوقات (جن وانس کو) اپنے احاطے میں لے لیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ طائف سے واپسی میں اختتام سفر سے پہلے سورۂ انبیاء کی آیات کا (خصوصاً آیت ۱۰۷ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ) نزول نبی کریم رؤف الرحیم، علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شفقت علی الخلق اور انہیں عذاب سے بچانے کی خواہش پر دلالت کے علاوہ مقتضائے کلام میں یہ اشارہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو سارے جہانوں کے لئے ہی رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں اس لئے اپنے آپ کو محض مکہ مکرمہ اور اس کے نواح ومضافات تک ہی محدود نہ رکھئے بلکہ اپنی دعوت کو تمام زمین وزمان کے لوگوں تک پھیلایئے۔ (۳۶)

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طائف کے سفر پر عام الحزن یعنی ۱۰ نبوی میں اواخر شوال میں تقویمی مطابق کے اعتبار سے ۵/جون ۶۲۰ء کو (۳۷) یعنی سخت گرمی کے موسم میں روانہ ہوئے تھے۔ جبکہ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا گھر میں دو صاحبزادیوں سیدہ امّ کلثومؓ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ گھر کی دیکھ بھال کے لئے اکیلی تھیں اور جنہیں وفات حضرت خدیجہ کے بعد آنحضور ﷺ کے حبالۂ عقد میں آئے ہوئے بمشکل چند روز ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طائف سے مکہ واپسی اواخر ذی قعدہ ۱۰ نبوی (اواخر جون، ابتدائے جولائی ۶۲۰ء) میں ہوئی تھی۔ (۳۸)

۵۔ عام الحزن ۱۰ نبوی کے اختتام میں ابھی ذیقعدہ کے بقیہ ایام اور ذی الحجہ کا آخری مہینہ باقی تھا۔ طائف کے سفر پر تشریف لے جاتے ہوئے افراد وقبائل کو دعوت اسلام دینے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، اسے آپ نے نہ صرف یہ کہ طائف میں جاری رکھا تھا بلکہ واپسی کے بعد بھی اسی معمول کو اختیار فرمایا، چنانچہ قاضی سلمان منصور پوری نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ''مکے میں واپس آکر نبی ﷺ نے ایسا کرنا شروع کیا کہ مختلف قبیلوں کی سکونت گاہوں میں تشریف لے جاتے یا مکے سے باہر چلے جاتے اور جو کوئی مسافر آتا جاتا مل جاتا اسے ایمان اور خدا پرستی کا وعظ فرماتے (۳۹) اس کی تفصیل میں موصوف نے بنو کندہ، بنو عبداللہ، بنو حنیفہ، بنو عامر بن صعصعہ کے قبائل کا ذکر کیا ہے۔ (۴۰) اور یہ لکھا ہے کہ قبائل کے سفر میں حضور

کے رفیق ابوبکر صدیق تھے۔ وہ آگے کہتے ہیں کہ انہی ایام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (یثرب کا) سوید بن صامت ملا۔ اس کا لقب اپنی قوم میں کامل تھا (۴۱) ملاقات کے بعد وہ بلا تامل اسلام لے آیا۔ جب یثرب لوٹ کر گیا تو قوم خزرج نے اسے قتل کر ڈالا (۴۲) انہی ایام میں ابوالحسیر انس بن رافع مکے آیا اس کے ساتھ بنی عبدالاشہل کے بھی چند جوان تھے جن میں ایاس بن معاذ بھی تھا یہ لوگ قریش کے ساتھ اپنی قوم خزرج کی طرف سے معاہدہ کرنے آئے تھے۔ انہی ایام میں ضماد ازدی مکے میں آیا یہ یمن کا باشندہ تھا اور عرب کا مشہور افسوں گر تھا (ایضاً) وہ حضور صلی اللہ کا علاج اپنے منتر سے کرنے آیا تھا مگر حضورؐ سے خطبہ مسنونہ سن کر دل دے بیٹھا اور بیعت اسلام میں آ گیا (۴۳)

ایام حج (۱۰ نبوی) میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی معمول جاری رہا۔ (۴۴) اسی زمانے میں (ایام الحج رذی الحجہ/ایام تشریق) آنحضرت صلیہ اللہ علیہ وسلم کی ملاقات (مدینہ سے آنے والے حجاج و زائرین کے ایک گروہ/انصار یعنی) خزرج کے چھ آدمیوں سے منیٰ میں جمرۃ العقبہ کے قریب ہوئی۔ (فبینا ھو عند العقبة لقی رھطاً من الخزرج) (۴۵) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اللہ کی طرف بلایا، ان پر اسلام پیش کیا اور ان کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ (۴۶) چنانچہ بہ توفیق الٰہی (اراد اللہ بھم خیراً) وہ سب ایمان لے آئے۔ (۴۷) ان حضرات کا ایمان لانا خود ان کے لئے بھی وجہ افتخار تھا۔ کیونکہ وہ پورے شعور و ادراک کے ساتھ، اپنے پڑوسیوں یعنی یہود پر سبقت حاصل کرتے ہوئے نبی موعود پر ایمان لا رہے تھے اور دولت اسلام اپنے دامن میں سمیٹ چکے تھے، ان کا ایمان دوسری طرف حضور سرور کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کے لئے بھی باعث اطمینان و مسرت تھا کیونکہ فروغ اسلام کی نئی جہت لامحدود امکانات کے ساتھ روشن ہو رہی تھی۔ مختصر یہ کہ (جمرۃ العقبہ کے قریب) وادی منیٰ کی ایک گھاٹی میں پیش آنے والا یہ واقعہ چاہے انصار میں ابتدائے اسلام کے عنوان سے یاد کیا جائے یا اسے بیعت عقبہ اول قرار دیا جائے۔ (۴۸) بہر حال توسیع دعوتِ اسلامی کی وسیع الاطراف پیش قدمی کا منزل نشاں آغاز تھا۔ خلاصہ گفتگو یہ کہ مجموعی طور پر یہ سہ سالہ (۷ تا ۱۰ نبوی) دور ہر لحاظ سے انتہائی اہم اور جہت ساز دور ثابت ہوا۔

(۳)

عام الحزن (۱۰ نبوی/۲۰۔۶۱۹ء) اختتام پذیر ہوا، تو توسیع عداوتِ قریش، کی صورت حال اور توسیع دعوتِ نبوی کا منظر سامنے آ گیا قریش کی طرف سے مسلط کردہ معاشرتی مقاطعہ کا تین سالہ دور ابھی ختم ہوا تھا یہ دسواں سال (نبوت) نئی آزمائشیں ساتھ لایا۔ مجموعی طور پر اس سال کا زیادہ تر حصہ (محرم تا

شوال/۹، ۱۰ ماہ کا عرصہ) ایسا گزرا کہ جس میں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کو پے در پے صدمات (وفات جناب ابوطالب/وصال حضرت خدیجہؓ اور صاحب زادے جناب عبداللہ کی رحلت) سے دوچار ہونا پڑا، اور سخت مصائب ومشکلات کا (سفر طائف) سامنا کرنا پڑا، نیز یہ بھی صحیح ہے کہ اللہ ورسول کے دشمنوں یعنی کفار قریش کی عداوت کا پلہ اس لحاظ سے بھاری رہا کہ دوسرے اہل ایمان کو ستانے کے ساتھ ساتھ (بنو ہاشم کے سردار جناب ابوطالب کی حمایت ونصرت کا سایہ اٹھ جانے سے) جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سختیوں کا نشانہ بنانے اور براہِ راست زک پہنچانے کا موقع بھی انہیں میسر آ گیا۔ قریش کے لئے یہ بھی موجب اطمینان ومسرّت تھا کہ

الف: حضرت خدیجہؓ جیسی عظیم خاتون کے نہ ہونے سے آنحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ صرف یہ کہ پریشان خاطر ہوں گے اور گھر بار بچوں کی فکر ونگہداشت سے آپ کی دل جمعی متاثر ہوگی بلکہ جوشِ تبلیغ بھی ماند پڑ جائے گا۔

ب: صاحب زادے کی وفات، غم واندوہ، یاسیت کو اور گہرا کر دے گی کہ ان کی نسل ختم ہوگئی اور اب کوئی نام لیوا باقی نہ رہے گا، پھر طعنہ زنی کا سلسلہ انہیں مزید افسردہ کرے گا۔

ج: یہ خبر بھی قریش کے لئے باعث تقویت وطمانیت ہوئی ہوگی کہ (جڑواں شہر) طائف کے سرداروں نے بھی دعوت حق کو ٹھکرا دیا اور داعی اسلام کو شہر سے باہر نکال دیا

د: جیسا کہ مشہور ہے اگر وہ روایت درست مان لی جائے جس کے تحت سفر طائف سے واپسی پر مکہ مکرمہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ کا داخلہ جوار مطعم بن عدی (بنونوفل) کے سائے میں ہوا تو اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ شہر کے مخدوش حالات میں تحفظ جان کے لئے (اپنا گھر بار ہونے کے باوجود) کسی نہ کسی ضامن رضمانت کی ضرورت تھی۔

صورت حالات کی یہ سنگینی اگر دوسرے کسی انسان کو اپنی گرفت میں لیتی، تو اس کا حواسوں میں رہنا ہی ناممکن ہو جاتا، دل ودماغ کو قابو میں رکھنا، معمولات زندگی کو برقرار رکھنا اور کسی اعلیٰ سنجیدہ مشن کی تکمیل کے لئے، خطرات کے باوجود، ڈٹے رہنا ممکن نہ ہوتا، تحریک ختم ہو جاتی، جوش وجذبہ ہوا ہو جاتا، (قریش بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے) لیکن ان صدمات وسانحات اور مصائب ومشکلات کا سامنا اس وقت کوئی عام انسان نہیں، فخر انسانیت کر رہا تھا، ان غیر معمولی حالات کا مقابلہ کوئی معمولی بندہ بشر نہیں، خیر البشر کر رہا تھا، جس کا ہر نفس تابع فرمان الٰہی تھا اور جس کا ہر قول وعمل تعمیل رضائے ربانی کے لئے وقف تھا۔ چنانچہ وہ داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نہ ڈرا، نہ دبا، نہ گھبرایا، بلکہ اپنے مشن کی پاسداری، راہِ حق پہ استواری اور ہر

حال میں احکامِ الٰہی سے وفاداری پر ڈٹا رہا۔ بلکہ اگر مولانا محمد اجمل خاں کی تحقیق کے مطابق ''سیدنا رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم'' پر قرآن (جو اپنی ایک حیثیت میں سیرت رسول اللہ علیہ وسلم اور اس وقت کے عرب معاشرہ کا ہم عصر علمی تاریخی مآخذ بھی ہے) کا جو حصے (آیات وسورۃ بہ ترتیب نزولی) اس سہ سالہ دورِ آزمائش (محرم ۷ نبوی تا محرم ۱۰ نبوی) میں نازل ہوا (۴۹)۔ اس سے پتہ چلتا ہے:

۱۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہ کارِ نبوت معطل ہوا نہ معمولاتِ دعوت میں فرق آیا، ہاں حالات و ضروریات کے تحت تدبیر بدلتی رہی اور تحریک کا رخ بدلتا رہا

۲۔ یہ بھی بہ خوبی اندازا ہوتا ہے کہ مکی سورتوں کا معتد بہ حصہ اسی دور میں اترا، جس کے بین السطور کفار قریش کے استہزا، استکبار، غرور ونخوت، دھونس، دھاندلی، اور معاندانہ روّیے کی نشاندہی کے ساتھ اہل ایمان کی تربیت کی جاتی رہی نیز تاریخی حوالوں سے صبر وضبط کی تلقین، انجام کار کامیابی کا یقین پیدا کیا گیا۔

۳۔ پیش آنے والا ہر واقعہ اور رونما ہونے والا ہر حادثہ الہامی رہنمائی میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس مطمئنہ میں سکینت بھر دیتا، آپ کے ثبات واستقلال میں اضافہ کر دیتا، توکل، صبر اور شکر کی کیفیتیں دوچند کر دیتا تھا اور دنیاوی سہاروں سے بے نیازی اور جوش پیدا کر دیتی تھی۔

گھر گھرہستی، امور خانہ داری اور بچوں کی فکر ونگہداشت کے حوالے سے ایک مناسب انتظام یہ ہوگیا کہ حضرت سودہ بنت زمعہؓ کاشانۂ نبوت میں زوجۂ محترمہ کی حیثیت سے آگئیں۔ جو سبقت اسلام، مہاجرت، خلوص وتقویٰ، تجربہ، سلیقہ اور محبت رسول کے لحظ سے نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔ صاحب زادے (عبداللہ) کی وفات پر رنج وملال تو فطری تھا لیکن اس موقع پر کفار قریش کی طرف سے آپ کو ''ابتر'' کہنا اور مقطوع النسل ہوجانے کی طعنہ زنی کا جو جواب رب العالمین نے سورۃ الکوثر نازل کر کے خود دے دیا ہے (۵۰) اس میں اللہ رب العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''خیر کثیر'' عطا کئے جانے کی خوش خبری سنائی اور ابتر اور مقطوع النسل ہونے کی پھبتی خود کفار قریش پر پلٹ دی اور ابتر کے طعنے کا مصداق خود انہی کفار ومشرکین کو قرار دے کر بتادیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام لیوا تاریخ کے ہر زمانے میں کثرت سے ہوں گے۔

عام الحزن ۱۰ نبوی کے اواخر تک پہنچتے پہنچتے یہ امر واضح ہوگیا کہ مکہ مکرمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شبانہ روز مساعی جمیلہ کے نتیجے میں بسنے والوں میں سے جنہیں ایمان لانا تھا وہ اس سعادت سے مشرف ہو چکے لیکن جو محروم رہے ان پر گویا اتمام حجت ہو چکا وہ کفر وشرک پر راضی ہیں تو تباہی ان کا مقدر ہوگی۔ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۵۱) یا انہوں نے دعوتِ حق کے مقابلے میں اپنے آپ کو گونگا بہرا اندھا بنا لیا ہے وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ

(۵۲) یا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ پیغام نبوی کی مزاحمت کر کے جیت جائیں گے (۵۳) یا شاید پھر وہ کسی حادثے کا انتظار کر رہے ہیں جو انہیں چونکا دے۔ بہر حال اب وقت آ گیا تھا اہل مکہ کو ان کے حال پر چھوڑ کر (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم) آگے بڑھیں اور نئی راہیں تلاش کریں۔ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۚ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۵۴) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا (۵۵)

اس سال کے آخری دو ڈھائی مہینے بہت اہم تھے۔ خصوصاً شوال ۱۰ نبوی میں طائف کا تبلیغی سفر دعوتِ حق کے نئے افق سامنے لایا۔ دعوت اسلامی کا ایک مستقر ہجرت حبشہ کے نتیجے میں ۶/۵ نبوی میں ہی مکہ سے باہر افریقہ رحبشہ میں قائم تھا اور پیغام الٰہی کی آفاقیت و بین الاقوامیت روبہ عمل آ چکی تھی۔ اب طائف کے سفر میں اگرچہ اہل طائف رؤسا اور سرداروں کے منفی ردّیہ نے رؤسائے قریش کی یاد تازہ کر دی اور سید الثقلین کی دعوت رد کر کے انسانوں کے محدود حلقے تک اس کی رسائی ناممکن بنا دی مگر طائف کے واپسی سفر میں جنوں کی غیر مرئی مخلوق میں سے ایک گروہ سیّد الانس والجان کے لب ہائے مبارک سے تلاوت قرآن سن کر ایمان لے آیا اور اپنی قوم میں از خود پیغام رسالت کا داعی بن کر لوٹا (۵۶)۔ توسیع دعوت اسلامی کا یہ ایک ایسا رُخ تھا، جس نے یہ پیغام کائنات کی لامحدود وسعتوں تک پھیلا دیا، اور مخلوقاتِ جن وانس کو اپنے دائرے میں لے کر اسلام کا آفاقی پہلو نمایاں کر دیا۔ مولانا محمد اجمل خاں نے شوال ۱۰ نبوی میں نازل ہونے والی آیات وسورۃ (۵۷) کی فہرست کے ساتھ (محرم ۱۰ تا صفر ۱۳ نبوی تک کے مجموعی دور کے لئے) جو عنوان ''رسول اللہ الی العالمین'' قائم کیا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے۔ (۵۸) اور ہمارے نزدیک اس مرحلۂ دعوت پر واقعاتِ سیرت کی صحیح تعبیر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی (نخلہ میں ایمان اَجنہ کی صورت میں) یہ کامیابی غالباً اللہ کی طرف سے عطا کردہ تحفہ تھا جو آپ کو تعمیلِ حکم ربانی (۵۹) میں طائف میں بے مثال صبر استقلال، اور ملک الجبال کے سامنے اس مظاہرہ پر عطا ہوا کہ امید ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں ایمان لے آئیں۔ (موجود لوگوں کے ایمان کی جلدی نہیں)

بہر حال اس امر کے باوجود کہ نبوت کا دسواں سال قریش کے لئے بڑا ''حوصلہ افزا'' تھا۔ اس سال کے آخری دو ڈھائی مہینے دعوتِ اسلام کے حوالے سے بھی توسیع وفروغ کی نئی جہات لے کر آئے۔ ایک طائف کے تبلیغی سفر میں غیر مرئی مخلوق جنوں کا قبول اسلام اور دوسرے ذی الحجہ کا پہلا عشرہ گزرتے ہی اہل مدینہ کے خزرجی گروہ کا قبولِ اسلام اجنہ کے قبول اسلام سے دعوت نبوی کی آفاقیت ظاہر ہوئی اور اہل مدینہ کے قبول اسلام سے توسیع دعوت نبوی کا نیا در کھل گیا۔ قریش مکہ کو ان دونوں باتوں کی خبر نہ ہو سکی۔ وہ حسب سابق حوصلہ مندی کے ساتھ عداوتِ اسلام کے محاذ پر ڈٹے رہے۔

(۴)

اگلے سال یعنی ۱۱ نبوی (میں) قریش کی معاندانہ سرگرمیاں جاری رہیں البتہ وہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کے زیادہ شائق رہنے لگے کیونکہ (وہ دیکھ چکے تھے کہ تعذیب المسلمین کے نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے)۔ آپ ﷺ کو نشانہ بنانا ان کے لئے زیادہ باعثِ تسکین تھا اور وہ پرامید تھے کہ نامساعد حالات اور چند در چند مشکلات سے توسیع دعوتِ نبوی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اہل ایمان ضعیف سے ضعیف تر ہوتے چلے جائیں گے اور وہ خود طاقتور اور زور آور (سورۂ قصص کی ابتدا میں (جو پہلے نازل ہو چکی تھی) حضرت موسیٰ و فرعون کی حکایت میں تاریخی حوالہ سے یہ بتایا جا چکا تھا کہ فرعون نے بھی اپنے زمانہ میں بہت سر اٹھا رکھا تھا، اور وہاں کے باشندوں کو گروہ در گروہ بنا کر کمزور کر دیا تھا۔ لیکن اللہ نے پھر یہ چاہا کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو کمزور کر دیئے گئے اور ان کو پیشوا بنائیں اور ملک کا وارث بنائیں اور انہیں طاقتور کر دیں) (۶۰) اس سال کے ابھی پانچ چھ مہینے ہی گزرے تھے کہ اللہ رب العالمین نے اپنے بندۂ خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو، جسے قریش کی نگاہِ غلط پست و کمتر سمجھ رہی تھی، اسراء و معراج سے سرفراز کر کے فرش خاک سے اٹھا کر لمحوں مین عرشِ پاک پر پہنچا دیا۔ یہ واقعہ اسراء و معراج ۲۷ رجب کو بہ حساب تقویم مکی شمسی خریفی مطابق ۲۶ اپریل ۶۲۱ء ہجرت سے تقریباً ۱۷ ماہ قبل (۶۱) پیش آیا۔ یہ عظیم الشان واقعہ نہ صرف یہ کہ پوری تاریخ انسانی میں بے مثال ہے بلکہ پیغمبرانہ عروج و صعود کا عدیم النظیر لمحہ تھا۔ اس واقعہ (اسراء و معراج) نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی و منصبی، ظاہری و باطنی قدر و منزلت ہی ثابت نہیں کی بلکہ آں جناب کی مستقبلیاتی رفعت و شان بھی ظاہر کر دی۔ کفار قریش کے لئے حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا (جسم ظاہری کے ساتھ) ایک ہی رات (بلکہ اس کے کچھ حصّہ) میں مسجد حرام مکۂ مکرمہ سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک کا سفر (اسراء) اور پھر آسمانوں کی سیر، سدرۃ المنتہیٰ تک رسائی (معراج) کے بعد واپسی ناقابل یقین امر تھا۔ (عقل، حواس، عادت اور تجربہ ہر لحاظ سے، اور معراج ظاہر ہے ان سب سے ماورا چیز تھی) قریش اور دوسرے کفار و مشرکین کے لئے واقعۂ معراج قرآن کی رو سے ایک آزمائش (فتنہ) ثابت ہوا۔ بجائے اس کے کہ اسے دلیل نبوت سمجھتے یا کوئی سبق حاصل کرتے یا تنبیہ پکڑتے، مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مذاق اڑانے لگے اور سرکش ہو گئے۔ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝ (۶۲) سورۃ النجم میں قریش کے رویے پر ان الفاظ میں گرفت کی گئی

ہے: افتمارونہ' علیٰ ما یریٰ (۶۳) کیا تم لوگ پیغمبر برحق سے اس بات پر جھگڑ رہے ہو کہ جو کچھ اس نے (سفر معراج میں) دیکھا؟ مطلب یہ تھا کہ جس ذاتِ بابرکت سے اَن دیکھے کبھی کسی کذب کا ارتکاب نہیں ہوا وہ بھلا بہ چشم خود دیکھے ہوئے واقعات و مشاہدات کے بارے میں کس طرح کذب بیانی کر سکتا ہے؟

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ''وقوع معراج'' سے پہلے، عداوتِ قریش کے نتیجے میں، مکہ مکرمہ کے سیاسی، سماجی، مذہبی حالات، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لئے کس درجہ ناسازگار تھے، اور اپنی ذاتی حیثیت میں بھی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی ناروا زیادتیوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے کہ یکا یک واقعۂ معراج پیش آیا، جس کی اطلاع پاتے ہی قریش کو ایک موضوع ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے اپنے الٹے سیدھے جارحانہ سوالات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کی بہت کوشش کی لیکن آپ کے ٹھیک ٹھیک جوابات اور بہ طور شہادت کئی نشانیوں کی صداقت کے بعد وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ قریش کے لئے اس واقعہ (معراج) کی اس سے زیادہ اہمیت تھی بھی نہیں۔ لیکن یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، مسلمانوں اور دعوتِ اسلام تینوں حوالوں سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

واقعہ اسراء و معراج ایک طرف تو ذاتی حیثیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے مثل روحانی سفر اور ادراکات و مشاہدات کے مرقع، آپؐ کے علو مرتبت اور اللہ کے نزدیک آپؐ کی قدر و منزلت کا ثبوت تھا۔ نیز منتہائے واقعہ میں لقائے رب اور حضوریٔ بارگاہِ خداوندی نے وہ کیف و سرشاری عطا فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پچھلے تمام غم بھول گئے۔ صدمات و سانحات کے تمام بادل چھٹ گئے، نیا ساں نیا منظر طلوع ہوا، رضائے الٰہی کے حصول کا نیا عزم پیدا ہوا۔

تحریکِ اسلامی میں ایک نیا سنگ میل آیا۔ اب تک کے نصابِ دعوت و تبلیغ میں عقائد و نظریات (ایمانیات/توحید رسالت آخرت) اور اخلاقیات کی تعلیم و تربیت پر توجہ مرکوز تھی تا کہ جو آنے والے آئیں ان کی ذہنی فضا، فکری منظر، نظریاتی پس منظر بدل جائے (ان کا تزکیہ ہو جائے۔ نئی آبیاری کشت کاری کے لئے زمین ہموار ہو جائے۔ معراج میں بندۂ خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ بقرہ کی آخری آیات (نمبر ۲۸۵، ۲۸۶) / یعنی آداب و رسومِ بندگی و طاعت کا نوشتہ/ اور (بندگی کامل کا مظہر) نماز (صلوٰۃ) کا تحفہ عطا کیا گیا یعنی مسلمانوں (امت مسلمہ) پر پانچ وقت کی نماز فرض قرار دی گئی (فجر و عصر کی ۲ نمازیں مسلمان قبل ازیں پڑھتے تھے لیکن معراج میں پانچ وقت کی فرض ہوئیں (۶۴) فرض نماز ذاتیات کے درجے میں تو یہ معنی رکھتی ہے کہ جو بندہ نماز کا قصد کرے وہ معراج کے کیف و کم میں کھو جائے، اور حضوریٔ رب سے لذت آشنائی پیدا کرے۔ نبوت کے گیارہویں سال (یعنی ہجرت مدینہ سے سال ڈیڑھ سال

پہلے) نصاب دین میں شامل کر کے عبادات و اعمال کے پورے نظام کی تشکیل کا سلسلہ شروع ہوا۔ گویا اجتماعی حیثیت میں تہذیبِ نفس (عقائد و ایمانیات) کے بعد، تنظیمِ جماعت کی تدبیر اور تربیت اعمال کا انتظام ہو رہا تھا۔ یہ ایک بڑی تبدیلی کا آغاز تھا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر تاریخ رسالت نئی منزل سے ہم کنار ہوئی تو تبلیغ و دعوت کے نصاب میں بھی عملی تربیت کا باب شامل ہوا۔ اور مسلمانوں کو نماز کے ذریعہ صف بندی، نظم جماعت، اطاعت امر کا پابند بنا کر پیش قدمی کے لئے گویا عملاً تیار کیا جانے لگا۔ واقعۂ معراج کی متابعت (Follow up) میں سورۃ الاسراء یا سورۂ بنی اسرائیل کا نزول خاص اہمیت رکھتا ہے۔ (۶۵)

توسیع دعوتِ نبوی کے سلسلہ میں ایک انقلاب آفریں لمحہ وہ آیا جبکہ (اسی گیارہویں سال نبوت کے) ایام حج (ایام تشریق رذی الحجہ) میں (مشہور قول کے مطابق) پہلی بیعتِ عقبہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل یثرب/اہل مدینہ کے منتخب افراد کے درمیان) منعقد ہوئی۔ یہ بیعتِ عقبۂ اولیٰ (ایک سال پہلے ۱۰ نبوی میں) اہل مدینہ کے خزرجی گروہ کے چھ افراد سے آپ کی (اسی مہینہ، انہی ایام اور اسی مقام پر) ملاقات کا نتیجہ تھی، جنہوں نے خود سبقت اسلام کی سعادت حاصل کرنے کے بعد وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دیں گے اور آئندہ سال پھر آپؐ سے ملکر رپورٹ دیں گے۔ چنانچہ بیعتِ عقبۂ اولیٰ میں شرکت کرنے والے (حضرت جابر بن عبداللہ بن رئاب کے علاوہ) چھ میں سے پانچ حضرات وہی تھے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پچھلے سال ملاقات کی تھی اور مزید سات حضرات (حضرت معاذ بن حارث، زکوان بن قیس، عبادہ بن صامت، ابوعبدالرحمٰن بن یزید، عباس بن عبادہ (خزرج سے) اور ابوالہیثم بن التیہان اور عویم بن ساعدہ (اوس سے) رضی اللہ عنہم) یعنی کل بارہ مدنی حضرات نے اس بیعت میں حصہ لیا۔ بیعت ان باتوں پر کی گئی۔ (۶۶)

۱۔ ہم خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے ۲۔ ہم چوری اور زنا کاری نہیں کریں گے ۳۔ ہم اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہیں کریں گے ۴۔ ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی کیا کریں گے۔ ۵۔ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہر ایک اچھی بات (معروضات) میں کیا کریں گے (۶۷) اس بیعت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ان باتوں کو پورا کرو گے، ان کی پاس داری کرو گے تو اس کا بدلہ جنت ہے اور اگر کسی بات میں نافرمانی، بدعہدی کا ارتکاب کرو گے تو یہ اللہ پر منحصر ہے چاہے عذاب دے چاہے بخش دے۔ (۶۸)

بیعت عقبۂ اولیٰ کا مضمون بتا رہا ہے (۶۹) کہ مدینے میں اسلام کی بات کافی آگے بڑھ چکی تھی اور سال بھر پہلے (۱۰ نبوی میں) توسیع دعوت نبوی کا جو در کھلا تھا وہ یثربی/مدنی ماحول کو بہت کچھ متاثر کر چکا

تھا (۷۰)۔ چنانچہ بیعت میں عقائد وعبادات سے آگے اعمال وافعالِ معاشرت میں احتیاط اور ہر معقول و معروف بات میں اطاعتِ رسول کا عہد اس امر کا اشارہ بلکہ کنایہ تھا کہ اُس سرزمین پر ایک نئی ''اجتماعیت'' جنم لے رہی ہے اور یہ بھی ظاہر تھا کہ (مختلف النوع نسلی، خاندانی، معاشرتی) اختلافات کے باوجود فضا سازگار ہو رہی ہے یا کم از کم تحریک اسلامی کی راہ میں رکاوٹوں کا سامنا نہیں ہے۔ اس کا مزید ثبوت اس وقت سامنے آیا جبکہ بقول مولانا شبلیؒ خود اہل مدینہ نے خواہش ظاہر کی کہ احکام اسلام سکھانے کے لئے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ (۷۱) یا بقول مولانا سلیمان منصور پوری یہ لوگ جب واپس جانے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعلیم کے لئے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو ساتھ کر دیا (۷۲)۔ یا بقول ابن سعد جب یہ لوگ لوٹ کر مدینہ چلے گئے اور پھر انہوں نے یہ درخواست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تحریراً بھیجی کہ ہمارے پاس ایک ایسا معلّم بھیجا جائے جو ہمیں قرآن پڑھائے (ابعث الینا مقرئاً یقرءنا القرآن) تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعبؓ کو مامور فرمایا (۷۳) بہرصورت حضرت مصعبؓ بن عمیر کا تقرر (اہل مدینہ کو قرآن پڑھانے کے لئے/تعلیم دین/احکام اسلام سکھانے/توسیع دعوتِ نبوی/فروغ اجتماعیت کے لئے/ان کی خیر خبر نگرانی/ان کا جائزہ لینے/مستقبل کی صورت گری کرنے) ہر لحاظ سے معنی خیز، ایک بڑا سنگ میل تھا۔ بیعت عقبۂ اولیٰ کے نتائج وثمرات کا اندازہ ظاہر ہے فوری نہ ہوسکتا تھا اس کے لئے ایک سال یعنی اگلے موسم حج (ذی الحجہ ۱۲ نبوی) کا انتظار ضروری تھا۔ یہ بیعت (عقبہ اولیٰ) چونکہ انتہائی احتیاط، رازداری سے، وادیٔ منیٰ کے ایک کونے میں، رات کا ایک پہر گزرنے کے بعد ہوئی۔ اس لئے قریش کو اس پیشرفت کی خبر نہ ہوسکی۔ (انقلاب دبے پاؤں آرہا تھا)۔

(۵)

بیعت عقبۂ اولیٰ (اہل مدینہ سے رہ ورسم استوار ہونے) کے بعد توسیع دعوتِ نبوی کی مدنی شاہراہ کھل گئی۔ قریش مکہ کو تو اس کی نہ خبر تھی نہ ادراک لیکن فراستِ نبویؐ دعوتِ حق کا تابناک مستقبل دیکھ رہی تھی جو بتدریج روشن ہوتا جارہا تھا۔ اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ معمول کے مطابق اپنی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں (مثلاً مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات میں بسنے والی آبادیوں، تجارتی منڈیوں میں آنے والوں، بیرونِ مکہ سے آنے والے زائرین بیت اللہ اور موسم حج میں اطراف وجوانب سے منیٰ کا رخ کرنے والوں سے ملاقات اور آوازِ حق پہنچانے) کا سلسلہ اگرچہ جاری رہا اور وحی الٰہی کے مطابق تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہے، تاہم اب مرکز توجہ اور دعوت کا (واحد) ہدف اہالیانِ مکہ

مکرمہ نہ رہے تھے ایک تو اس لئے کہ اب ہدف تبلیغ رسول اللہ الی العالمین کی حیثیت سے نہ صرف عالم انسانیت قرار پایا تھا (۷۴) بلکہ جنوں کی غیر مرئی مخلوق بھی آپ کی دعوت و رسالت کو تسلیم کر چکی تھی (سفر طائف میں ان کے ایک گروہ کا ایمان اور کارِ انذار و تبلیغ پر فائز ہونا۔ (۷۵) بیرونِ مکہ تبلیغی سرگرمیاں اور حجاج و زائرین کے ڈیروں پر ملاقات اور دعوت اسلام اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ دوسرے یہ کہ اہل مکہ کے لئے انذار و تبلیغ کی کوششیں اپنی حد و انتہا تک پہنچ چکیں نقطۂ سیری (Saturation Point) آ گیا اور اتمام حجت کی صورت پیدا ہوگئی) اہل مکہ کے لئے پیغمبرانہ گرم جوشی اس لئے بھی کم ہوگئی کہ قریش کے رؤسا و امرا، اپنی انا، تکبر، فخر و غرور، ضد، عناد، ہٹ دھرمی اور اپنی دولت ثروت عزت پر گھمنڈ کے نتیجے میں پیغام الٰہی سننے کے لئے تیار نہ تھے اور عملاً یہ ثابت کر چکے تھے کہ دعوتِ نبوی انہیں کسی قیمت قبول نہیں۔ اس لئے دانستہ انہوں نے اپنے کان بند کر لئے، اپنی آنکھیں موند لیں، اپنے ذہنوں کو ماؤف کر لیا، اپنے دلوں پر تالے لگا لئے یعنی اندھے بہرے گونگے بن گئے۔ ان معروضی حالات میں قرآن کا یہ تبصرہ برمحل تھا کہ ''گونگے بہرے اندھوں کو کیا سنانا؟ اور فرمایا گیا کہ آپؐ (حق کے) اندھوں کو گمراہی سے نکال کر راہِ راست پر کیسے لا سکتے ہیں''۔ (۷۶)

اس دور میں محمد اجمل خاں کے نزدیک قرآن کا جو حصہ (محرم ۱۰ تا صفر ۱۳ نبوی) نازل ہوا خصوصاً ۱۲/۱۱ سال نبوت کے اواخر میں مثلاً روم، اعراف، الزخرف، یونس، اسراء وغیرہ (۷۷) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ (بیعت عقبہ اوّل کے بعد تقریباً) بارہویں سال میں قریش کی معاندانہ سرگرمیوں اور ان کی پیدا کردہ مشکلات کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ ڈرے نہ دبے نہ کوئی معذرت خواہانہ لب و لہجہ اختیار کیا، بلکہ اللہ پر توکل و اعتبار اور آسمانی وحی کی صداقت پر یقین کامل کے ساتھ، مغرور، طاقت کے نشے میں چور کفار و مشرکین کو تنبیہ فرماتے رہے کہ ''آپ فرما دیجئے کہ ذرا ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ تم سے پہلے ہوئے ہیں ان کا انجام کیا ہوا''۔ (۷۸) یہ لوگ ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھیں کہ ان سے پہلے کے لوگوں کا انجام کیا ہوا، جو زور و قوت میں ان سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے (۷۹) اور ہم نے تم سے پہلے بھی پیغمبروں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، وہ ان کے پاس نشانیاں (معجزات) لے کر آئے۔ سو جو لوگ (اللہ، رسول کی) نافرمانی کیا کرتے تھے ہم نے ان سے بدلہ لے کر ہی چھوڑا (فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا کیوں کہ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ O (۸۰) گویا بین السطور یہ پیغام دیا جا رہا تھا کہ جس طرح پچھلی امتوں کے) اہل ایمان کے لئے اللہ کی مدد واجب و لازم ہوئی تھی (اسی طرح) اب بھی پہنچے گی۔ اور اگرچہ پیش آنے والی مصائب و مشکلات دعویٔ ایمان کا حصہ ہیں لیکن ان آزمائشوں سے

نجات دلانا بھی اللہ ہی کے ذمے ہے۔ حقاً علینا ننج المومنین (۸۱) لہٰذا پیغمبر اعظم اور ان کے متبعین و مخلصین کو حالات سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں کہ ''اگر آپ کو جھٹلائیں تو کیا آپ سے پہلے بھی امتیں اپنے پیغمبروں کی تکذیب کر چکی ہیں اور پیغمبر کے ذمے کھول کر سنا دینے کے سوا اور کچھ نہیں''۔ (۸۲) ''ہم جانتے ہیں کہ ان (کفار مشرکین رقریش) کی باتیں آپ کو رنج پہنچاتی ہیں، مگر یہ (دراصل) آپ کو نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ یہ ظالم تو آیات الٰہی سے انکار کرتے ہیں۔'' (۸۳) حق آچکا ہے، اب جو سیدھی راہ (ہدایت) اختیار کرلے تو یہ راست روی اسی کے لئے فائدہ مند ہوگی اور جو گمراہ ہوا اس کی گمراہی خود اس کے لئے ضرر رساں رتباہ کن ہوگی۔ (۸۴) اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اس صورتِ حالات میں (قرآن کی روشنی میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لئے (بین السطور) جو لائحہ عمل تجویز کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس (ہدایت رتعلیم) کی پیروی کرتے رہئے آپ پر وحی کیا جاتا ہے اور صبر و استقلال سے کام لیجئے یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (۸۵) صبر! صبر! اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور ہرگز ہلکا نہ پائیں آپ کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔ (۸۶)

۲۔ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ O (۸۷) اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین وسیع ہے۔ پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ، بقول ایک مفسر یہ اشارہ ہے ہجرت کی طرف) مطلب یہ ہے کہ اگر مکے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ (۸۸)۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ O (۸۹) اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی، ضرور ہم انہیں اپنے راستے دکھادیں گے اور بیشک اللہ نیکوں (نیکوکاروں) کے ساتھ ہے۔ نئے راستوں، نئی راہوں کی تلاش تقاضائے بندگی ہے۔ نئی راہ نئے مستقبل، نئی دنیا سامنے لاتی ہے۔

۳۔ تمام تر جدوجہد کا مقصد مدعا بندگی رب ہے، اس پر قائم رہنا اور دوسروں کو اس کی دعوت دینا۔ یہی صراطِ مستقیم ہے اس میں کوئی اور غرض پنہاں نہیں۔ لوگوں کی حتی المقدور اصلاح، اور زندگی کی تمام صلاحیتوں کو پورے اخلاص کے ساتھ، اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف کردینا خلاصۂ عبادت ہے: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (۹۰) سورۂ ہود میں ہے کہ میں تو جہاں تک مجھ سے ہو سکے (تمہارے معاملاتِ زندگی کی) اصلاح چاہتا ہوں اور اس بارے میں مجھے توفیق ارزانی اللہ ہی کے (فضل) سے ہے۔ میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور

اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں (۹۱) اور سورۂ انعام کے الفاظ ہیں: قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ O قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ O (۹۲) آپ کہہ دیجئے کہ مجھے میرے رب نے سیدھا رستہ دکھادیا ہے، صحیح دین، دین ملت ابراہیمی جو اللہ کی طرف سے تھا اور وہ (حضرت ابرہیم) مشرکوں میں سے نہ تھے۔ آپ یہ بھی فرمادیجئے کہ میری نماز اور میری عبادت میری قربانی، میرا جینا اور مرنا سب اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے۔

بہرحال صبر وحکمت، توکل وغنا، ثبات واستقلال سے کام لیتے ہوئے نئی راہوں کی تلاش میں داعی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنائیں بر آئیں۔ اہل مدینہ سے رہ ورسم استوار ہونے کے بعد بیعت عقبۂ اولیٰ کی صورت میں توسیع دعوتِ نبویؐ کا جو در کھلا تھا، اور (اہل مدینہ کی خواہش اور درخواست پر، اس نئے ماحول میں) رسول اللہ الی العالمین کا سفیر (حضرت مصعبؓ) تعلیم قرآن اور تبلیغ دعوت کا جو مشن لے کر گیا تھا، اس کے اثرات سے وہاں کی کایا پلٹ گئی۔

(۶)

چنانچہ بارہواں سال نبوت ختم ہونے سے پہلے موسم حج آیا تو یثربی/مدنی قافلۂ زائرین (مجموعی طور پر ۵۰۰ حجاج بشمول مشرک ومومن حجاج) کے ساتھ سفیر رسولؐ (حضرت مصعب بن عمیرؓ) بھی مکہ واپس آئے (اور خدمت نبویؐ میں حاضر ہوکر مدنی ماحول، قبول اسلام کی رفتار، تعلیم وتبلیغ، دین کی کیفیت، اور جہانِ نو کی فضا، آب وہوا کی رپورٹ پیش کی) (۹۳)۔ فراغت حج کے بعد، یثربی وفد منیٰ میں قیام پذیر ہوا تو حسب قرارداد، ایام تشریق میں، بیتِ عقبۂ اولیٰ کے ہی مقام پر، ۷۵/۷۶ مدنی، اہل ایمان اور رسول اللہ الی العالمین کے درمیان بیعت عقبۂ ثانیہ (۱۲/۱۱ ذی الحجہ ۱۲ نبوی/ذی الحجہ اق ھ/۲۸/۲۷ جون ۶۲۲ء کو) منعقد ہوئی۔ یہ ایک تاریخی لمحہ تھا۔ جو توسیع دعوتِ نبوی اور مخالفت وعداوتِ قریش کے باب میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔ دیگر تفصیلات سے قطع نظر، اس موقع پر ۷۵/۷۶ نمائندگانِ اہل مدینہ کی طرف سے بیعت اور امام وپیشوا کی حیثیت سے اپنے ہاں (مدینہ) آنے کی دعوت اور حفاظت ومدافعت کا وعدہ اور جواباً سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمادگی اور ان کے ساتھ ہی جینے مرنے کا عہد، اپنی نوعیت واہمیت میں دراصل وہ ''معاہدۂ عمرانی'' (Social contract) تھا جس کے نتیجے میں (آئندہ چند ماہ میں) ایک ریاست/مملکت وجود پذیر ہونے والی تھی اور اس کے باشندے/نمائندے/بلا جبر وکراہ/برضا ورغبت/

تسلیم واطاعت کا اظہار کر رہے تھے (۹۴) اپنی اس (مقتدرانہ) حیثیت کا اظہار امام المسلمین ورسول اللہ الی العالمین نے، مجمع معاہدین کے مشورہ، رائے اور آزادانہ انتخابات کے ذریعہ ان میں سے ہی ۱۲/ نقیبوں کا تقرر فرمایا۔ (۹۵) ان نقبا کا تقرر بدیہی طور پر اس لئے تھا کہ مدینے میں تنظیم اجتماعیت و معاشرت کے کام میں تعطل واقع نہ ہو اور ایک بلدیاتی، معاشرتی اور کفالتی نظام متحرک ہو جائے۔ (۹۶)

مولانا شبلی نعمانی نے بیعت عقبۂ ثانیہ ۱۲ نبوی کا عنوان قائم کر کے واقعات کی کچھ تفصیل دی ہے نیز بارہ نقبا کا تقرر ان کے اسمائے گرامی نقل کئے ہیں۔ تاہم اس کی اہمیت سے بحث نہیں کی۔ البتہ یہ لکھا ہے کہ ''مدینے میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اجازت دی کہ مکے سے ہجرت کر جائیں۔'' (۹۷)

مشہور برطانوی مستشرق منٹگمری واٹ تمام بیعتِ ہائے عقبہ کو عموماً اور بیعت عقبۂ ثانیہ کو نہ صرف یہ کہ اس کو، اس کے جواز، اس کے شرائط، انعقاد اور اہمیت کو تسلیم کرتا ہے بلکہ بعض مغربی مصنفین / مستشرقین کے اعتراضات، شبہات اور الزامات کو رد بھی کرتا ہے اور بعض پہلوؤں پر سیر حاصل بحث بھی کرتا ہے۔ مثلاً مدنی معاشرہ کے عناصر آبادی (بنو قیلہ / انصار / اوس وخزرج، یہود بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنو نظیر) کی تفصیل اور جنگ حاطب، جنگ بعاث (جو ہجرت نبوی سے چند سال پہلے تقریباً ۶۱۷ء میں ہوئی) وغیرہ کا حوالہ دے کر یہ امر واضح کرتا ہے کہ اس سرزمین (مدینہ) میں ہر طرف نزاع، افتراق انتشار کا دور دورہ، امن وامان مفقود اور عدم تحفظ عام تھا اور اس بات کی واقعتاً سخت ضرورت تھی کہ ایک ایسی قوت قاہرہ (A single supreme authority) میسر ہو، جو اس معاشرہ کے منتشر و متفرق افراد اور متحارب گروہوں کے درمیان امن وامان قائم کر کے صلح وآشتی پیدا کرے اور جو تمام فرقوں اور فریقوں کے نزدیک یکساں قابل قبول ہو۔ (۹۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل مدینہ کی طرف سے پیغمبر و پیشوا تسلیم کر لینا، درست تھا اور (مکے کے مقابلہ میں مدینہ زیادہ منقسم ومتفرق تھا۔ حالات کے تحت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیغمبرانہ حیثیت اپنے سیاسی اطلاقات کے ساتھ اس لائق ضرور تھی جس سے اہل مدینہ بجا طور پر اتحاد / امن وامان کی امیدیں وابستہ کر سکتے تھے۔ واٹ کے خیال میں یہ مضمون قرآنی آیت (۹۹) سے بھی ظاہر ہے وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَإِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ O اور ہر ایک امت کی طرف پیغمبر بھیجا گیا، جب ان کا پیغمبر آتا ہے تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور کچھ ظلم نہیں کیا جاتا۔ وہ آگے لکھتا ہے کہ ایک پیغمبر اس اختیار و اقتدار کی بنا پر جو اسے بر بنائے خون / نسل نہیں بلکہ بر بنائے

دین/(وحی الٰہی) حاصل ہو، اس بات کا سزاوار ہے کہ وہ خون/نسل کی بنیاد پر بننے والے متحارب گروہوں کے درمیان کھڑا ہو اور ان کو انصاف فراہم کرے۔ چنانچہ انصار نے دراصل اپنے معاشرے کی عملی ضرورت کے تحت ہی (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بحیثیت پیغمبر قبول کیا تھا اور اس کا اثر و نتیجہ بلاشبہ ظاہر ہوا۔ بہرحال اگر یہ ان کی مذہبی ضرورت بھی کہی جاسکے تو اس کا حل (دعوتِ نبی یعنی) ''اسلام'' میں ہی تھا۔(۱۰۰)

بیعت ہائے عقبہ کے معترضین کو جواب دیتے ہوئے واٹ لکھتا ہے کہ ''عروہ کے بیان میں دو بیعت ہائے عقبہ کا نہ ہونا مغربی مصنفین کے اس نظریے کو تقویت دیتا ہے کہ اس قسم کی صرف ایک ہی بیعت منعقد ہوئی تھی، کیونکہ پہلی بیعت یعنی بیعت النسآء کا مواد/مضمون قرآنی بیان پر مبنی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ اجلاس/اجتماع کا ہی انکار کر دیا جائے۔ اس کے برخلاف یہ بالکل واضح ہے کہ اہل مدینہ اور آنحضرت ﷺ کے درمیان طویل مذاکرات بدیہی تھے۔ واٹ آگے لکھتا ہے کہ ہم عام طور پر پائے جانے والے بیان/بیانات کو قابل قبول سمجھتے ہیں۔ آپ ﷺ کا پہلا موثر رابطہ خزرجیوں سے ہوا تھا۔ لیکن آپؐ نے نسبتاً زیادہ نمائندہ افراد کی موجودگی کا اہتمام ضروری سمجھا۔ کیونکہ آپؐ ایک خاندان پر اعتماد دوسرے خاندان کی قیمت پر نہیں کر سکتے تھے۔ اس اجلاس کی تفصیلات چاہے جو کچھ ہوں، (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اہل مدینہ کے درمیان کسی نہ کسی قسم کے عبوری معاہدہ کا ہونا ناگزیر تھا جس میں آنحضرت کو رسول تسلیم کیا جانا بھی شامل ہو۔ مزید برآں بیعت عقبۂ ثانیہ کے موقع پر معاہدے کی شرائط و تفصیلات کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا جاسکتا ہے لیکن عمومی تفصیلات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔(۱۰۱)

بیعت عقبۂ ثانیہ کے اثرات و مضمرات کے بارے میں واٹ لکھتا ہے کہ اس اجلاس کی مرکزی بات کو کہ اس میں بیعت الحرب کی گئی قبول کیا جانا چاہئے۔ اگرچہ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ معاہدہ کس حد تک روبہ عمل آیا، اہل مدینہ نے اس بات کو بھی منظور کیا کہ وہ مہاجرین کا وفادارانہ استقبال کریں گے۔ واٹ کے نزدیک اس میں جو بات صاف نہیں ہے وہ یہ کہ اہل مدینہ نے مقابلۂ قریش کے لئے اپنے آپ کو کس طرح تیار پایا،(۱۰۲) اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ (اہل مدینہ) متذبذب تھے کہ قریش کی قوت روز افزوں ہے نیز وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ مکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ناپسندیدہ شخصیت کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے یہ ضمانت تو گویا موجود تھی کہ محمد ﷺ قریش مکہ کے لئے استعمال نہیں ہو سکتے۔ لیکن کیا اس طرح اہل مدینہ اپنے (شہر میں) آپ کا استقبال کر کے اور بااثر شخصیت کی حیثیت میں قبول کر کے اہل مکہ کو بھڑکانے کا باعث نہیں بن رہے تھے؟(۱۰۳)

یہ معاہدہ قریش مکہ کو بھڑکانے کا باعث یقیناً بنا۔ جس رات یہ معاہدہ ہوا اس کی صبح ہوتے ہوتے

اس کی بھنک قریش مکہ کے کانوں میں پڑ گئی، اور اس کی خیر خبر لینے کے لئے فوراً نکل کھڑے ہوئے (۱۰۴)۔ پہلے تو وہ یثربی وفد کے پڑاؤ پر پہنچے اور ان سے استفسار کیا کہ تم لوگوں میں سے (کچھ نے) آنحضور (صاحبنا) سے ملاقات کر کے جنگ پر بیعت کی ہے؟ وفد کے مشرک حاجیوں کو ظاہر ہے کچھ پتہ نہ تھا، انھوں نے حلفیہ لاعلمی ظاہر کی۔ پھر وہ ان کے سردار عبداللہ بن ابی سے ملے اور یہی پوچھا اس نے بھی کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میری قوم مجھے بے خبر رکھ کر اتنی بڑی بات کر گزرے اس پر وہ مطمئن ہو کر چلے گئے ان رؤسائے قریش میں حارث بن ہشام بن المغیرہ المخزومی جیسے لوگ شامل تھے۔ لیکن اس وقت تک تو پوری وادیٔ منیٰ میں ''بیعۃ الحرب'' کا واقعہ موضوع بحث بن چکا تھا۔ اس لئے قریش نے یثربی حاجیوں کا تعاقب کیا جو پہلے ہی روانہ ہو چکے تھے۔ ان میں سے دو آدمیوں کو جا لیا ایک سعد بن عبادہؓ اور دوسرے منذر بن عمروؓ کو۔ منذرؓ تو کسی نہ کسی طرح بچ نکلے البتہ سعدؓ بن عبادہ کو قابو کر لیا اور مارتے ہوئے حرم کعبہ تک لائے۔ حضرت سعدؓ بالآخر مطعم بن عدی/حارث بن حرب بن امیہ یا ابوالبختری بن ہشام کی دھائی دے کر ہی رہا ہو سکے (۱۰۵)۔ حالات و واقعات اب فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو گئے تھے۔

(۷)

ابن اسحاق کے مطابق جب نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دست اقدس پر انصار نے بیعت عقبۂ ثانیہ کر لی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کی اجازت مل گئی، (اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا) اور نہ صرف یہ کہ نصرتِ دین کی صورت پیدا ہو گئی بلکہ مسلمانوں کو ایک ٹھکانہ بھی میسر آ گیا تو حضور رسول اللہ الی العالمین نے اپنے اصحاب اور اہل ایمان کو ہجرت مدینہ کی اجازت مرحمت فرما دی کہ وہاں چلے جائیں اور اپنے انصاری بھائیوں سے جا ملیں (۱۰۶) چنانچہ اس کے بعد ہی، انفرادی اور اجتماعی طور پر، جس کے لئے جس طرح ممکن ہوا، مدینہ کے لئے تیز رفتار ہجرت شروع ہو گئی (۱۰۷)۔ اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا کے ساتھ اذنِ الٰہی کا انتظار فرمانے لگے: رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ○ (۱۰۸) اے میرے رب مجھ کو خیر و خوبی کے ساتھ (مدینہ میں) داخل کیجو۔ اور (مکے سے عزت و آبرو) خیر و خوبی کے ساتھ نکال لے جائیو اور مجھ کو اپنے پاس سے ایسا غلبہ (واقتدار) عطا کیجو جس کے ساتھ (تیری) نصرت (شامل) ہو۔ (۱۰۹)

دوسرے فریق (کفار و مشرکین مکہ کے لئے بھی فیصلہ کن مرحلہ آ گیا تھا۔ ان کے پاس بھی (بارھواں سال نبوت گزرنے کے بعد) دنوں/ہفتوں کی مہلت باقی بچی تھی جس میں انہیں کچھ کر گزرنا تھا۔

ایک تو وہ ہر تدبیر کر کے دیکھ چکے تھے، مگر نہ وہ سر پھرے اہل ایمان آباو اجداد کے موروثی دین سے منحرف ہونے والے قابو آ سکے نہ آواز حق دبائی جا سکی۔ اس پر مستزاد (بیتِ عقبۂ ثانیہ میں) اہل مدینے سے خفیہ معاہدہ نے ان کے ہوش اڑا دیئے، پھر مکے کے اہل ایمان جب اپنا گھر بار مال اسباب سب چھوڑ کر یثرب / مدینے کی طرف کبھی اکا دکا کبھی ٹولیوں میں جانے لگے۔ تو انہوں نے پکڑ دھکڑ شروع کر دی، ہجرت کرنے والوں کو روکا جانے لگا، ان کا مال و اسباب چھینا جانے لگا (۱۱۰)۔ مگر نہ کوئی خود رکا نہ وہ روک سکے بلکہ مکہ سے جانے والوں کے خالی گھر انہیں منہ چڑا رہے تھے۔ یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ سب سے اہم سوال تھا! اس سوچ بچار میں ذی الحجہ ۱۲ نبوی جون ۶۲۲ء کے بعد محرم ۱۳ نبوی جولائی ۶۲۲ء گزرا، اور صفر ۱۳ نبوی / اگست ۶۲۲ء آ گیا۔ بالآخر مکہ مکرمہ کے کفار و مشرکین کے بڑے بڑے سردار، رؤسا، زعما یعنی تمام عالی دماغ دارالندوہ میں جمع ہوئے (۱۱۱) ایک آخری فیصلہ کرنے کے لئے یہاں تک کہ قید یا جلاوطنی وغیرہ کی تجویزوں، تقریروں، شیطانی منصوبوں کی تان اس بات پر ٹوٹی کہ شمع رسالت کو گل کر دیا جائے یہی آخری علاج، اٹل فیصلہ ہے۔ قرآن نے ان کے فیصلوں سے آنحضور کو مطلع کر دیا تھا وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْيَقْتُلُوْكَ اَوْيُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ O (۱۱۲) ''اے محمد (ﷺ) (اس وقت کو یاد کیجئے) جب کفار (مکہ) آپ کے بارے میں مکارانہ چال چل رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو (گھر، بار، شہر، وطن سے) نکال دیں۔ (ادھر ایک طرف) تو وہ (کفار و مشرکین) اپنی چالیں چل رہے تھے (حالانکہ انہیں جان لینا چاہئے تھا) کہ اللہ ہی سب سے بہتر (چال چلنے) تدبیر فرمانے والا ہے۔

دارالندوہ میں کفار و مشرکینِ مکہ (کے خفیہ اہم اجتماع / اجلاس) کا ناروا فیصلہ (کہ شمع نبوی بجھا دی جائے) نہ صرف یہ کہ قریشی شیطنت کا آئینہ دار تھا بلکہ وہ انتہائی قدم تھا جو وہ اٹھانا چاہتے تھے چنانچہ اس کا فوری نوٹس لیتے ہوئے بارگاہِ الٰہی سے یہ تبصرہ صادر فرمایا گیا جو (۱۱۳) یوں منقول ہے: اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ O اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ۭ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ O کیا انہوں نے (قریش نے) کسی بات (قتل) کا فیصلہ کر لیا ہے؟ تو ہم بھی فیصلہ کئے دیتے ہیں (کہ یہ ان کے لئے کبھی ممکن نہ ہوگا) کیا یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں (خفیہ منصوبوں) اور سرگوشیوں کو سنتے نہیں ہیں؟ ہاں ہاں (سب سنتے ہیں) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہیں اور ان (کفار و مشرکین) کی سب باتیں لکھتے (جا رہے) ہیں۔

یہ صورت حالات اور زمینی حقائق بتا رہے تھے کہ اب قریش مکہ کے لئے رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ

وسلم کو برداشت نگلنا ناممکن نہ رہا تھا اور وہ پوری سنجیدگی سے شمع رسالت کو گل کرنے پر تل گئے تھے۔ کفار و مشرکین کا طرز عمل، ان کے عزائم، ان کے فیصلے ظاہر کر رہے تھے کہ قبول دعوت حق کی مزید سکت ان میں باقی نہیں رہی تھی، حجت تمام ہوگئی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا مکہ مکرمہ میں مزید قیام اور دین کے لئے محنت کرنا بار آور نہ تھا۔ لہٰذا ان کے درمیان سے نکل آنا عین تقاضائے وقت تھا (یعنی یہ راہِ فرار اختیار کرنے کی، جان کے خوف سے بھاگ جانے کی، مظالم سے تنگ آکر عافیت کی تلاش میں نکلنے کی کوئی بات نہ تھی (۱۱۴) بلکہ حق کے لئے، حق کی خاطر، راہِ حق میں نکلنے، قیام دعوت حق کے لئے نئی سرزمین میں قدم رکھنے اور دین کے لئے محنت کرنے کی مثبت ضرورت تھی۔ سورۂ یٰسین میں جس کی بعض آیات کی تلاوت فرماتے ہوئے ہجرت کی شب تاریک میں آپ ﷺ اپنے کاشانۂ اقدس سے مشرکین کے محاصرے سے یوں نکل گئے کہ پوری مستعدی کے باوجود وہ آپ کو نہ دیکھ سکے۔ اسی مضمون کی صراحت ہے ''ان میں سے اکثر پر (خدا کی) بات پوری ہوچکی ہے۔ سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں اور ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں اس لئے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں اور ہم نے ان کے آگے بھی (غیر مرئی) دیوار کھینچ دی ہے اور ان کے پیچھے بھی، پھر ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تو یہ دیکھ نہیں سکتے اور تم ان کو نصیحت کردیا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (۱۱۵)

(۸)

دارالندوہ (مکہ المکرمہ) میں نمائندہ سردارانِ قریش کا وہ تاریخی اجتماع اور اہم ترین اجلاس (جس میں ان سیاہ بختوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نجات پانے کے لئے قتل کی متفقہ قرارداد پاس کی تھی (۱۱۶) غالباً ۲۶ر صفر ۱۳ نبوی ر بدھ ۸ ستمبر ۶۲۲ء کو منعقد ہوا تھا (۱۱۷)۔ پھر ان ظالموں نے حسب قرارداد (آنے والی شب میں) مولانا شبلی کے بقول ''جھٹ پٹے سے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانۂ مبارک کا محاصرہ کرلیا تھا۔ (سیرۃ ج ۱ صفحہ ۲۶۱) اپنی دانست میں انہیں یقین تھا کہ ''شخص مطلوب'' ر ''صاحب قریش'' ان کے وار سے بچ کر نہ نکل سکے گا۔ ادھر جبرئیلؑ نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکمت عملی سمجھا دی ''آج کی رات اپنے بستر پر نہ گزاریں'' اتنا اشارہ کافی تھا۔ آپ نے پوری بات حضرت علی کو سمجھا دی، وہ سبز ردائے نبوی اوڑھ کر لیٹ گئے (۱۱۸)۔ رات ذرا گہری ہوئی اور دیکھ لیا کہ سب شمشیر بردار جمع ہوگئے ہیں، ان میں پیش پیش ابوجہل تھا۔ آپ نے مٹھی بھر خاک لی، دروازہ کھولا، ان کی طرف پھینکی اور سورۂ یٰسین کی آیات وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ

لَایُبْصِرُوْنَ O پڑھتے ہوئے ان کے درمیان سے (مثل خوشبو) نکلتے چلے گئے۔ محاصرین میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے سر پر خاک نہ پڑی ہو ان کی بصارت اللہ نے سلب کر دی۔ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ وہ (رسول برحق) کب نکلا اور کب گزر گیا (۱۱۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاشانۂ اقدس سے جنوبی سمت جبل ابوقبیس کے سائے میں مروہ سے صفا کی طرف چلے اور (موجودہ) باب عبدالعزیز سے آگے لیکن (موجودہ) باب فہد سے پہلے بائیں جانب مڑے اور مسفلہ میں داخل ہو کر تھوڑے ہی فاصلے پر حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے مکان پر تشریف لائے (یہ راستہ ابتک شارع الہجرہ کے نام سے موسوم و معروف ہے)۔ وہاں سب تیاریاں مکمل تھیں دونوں نفوسِ قدسیہ پا پیادہ صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے (جنوب مکہ میں ۳ میل/۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع) غارِ ثور میں (جو اب بھیر جع خلائق ہے) پہنچ کر قیام فرما ہو گئے۔

کفار مشرکین محاصرین کی آنکھیں علی الصبح واقعی کھلیں اور فراش نبوی پر حضرت علی کو پایا تو اپنی ناکامی و نامرادی پر ان کا حیران و پریشان ہونا فطری امر اور جھنجلا کر غضب ناک ہونا اور حضرت علیؓ کو سرزنش کر کے چھوڑ دینا مجبوری تھی بے بسی تھی۔ ان کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ چالیں تدبیریں سب بے کار گئیں، اس پر مزید غم و غصہ حیرانی کہ گئے کہاں؟ مدینہ جانے والا راستہ شمال میں تھا پہلے ادھر دوڑے پھر سارا مکہ چھان مارا ایک مرتبہ کھوجی جنوب مکہ میں غار ثور تک لے گئے، غار کا دہانہ بھی دیکھا مگر آثار نظر نہ آئے۔ حالانکہ ان کے مطلوب و مقصود نفوس عالی وہاں فروکش تھے۔ قریش مکہ کی بے بسی قابل دید تھی وہ سخت طیش میں تھے مگر بہت فکر مند۔ دارالندوہ میں ایک اور اجلاس طلب کیا گیا، اور تجویز یہ منظور ہوئی کہ جو کوئی بھی ان دونوں میں سے کسی کو بھی پکڑ کر لائے گا اس کا انعام سو اونٹ ہے (۱۲۰) اس بات کی منادی کر دی گئی اسے خوب مشتہر کیا گیا۔ وہ جانتے تھے کہ اتنے بڑے انعام کے لالچ میں جو بھی یہ اعلان سنے گا ''مفرورین'' کو ڈھونڈ نکالے گا۔ اعلان ہو گیا ایلچی دوڑا دئے گئے لیکن کوئی خبر نہیں مل سکی۔ اور نہ بقول ایک جدید مصنف مکے کے اندر یا باہر کسی ایک فرد نے یہ پوچھا کہ آخر محمد صلی اللہ چلیہ وسلم نے کیا جرم کیا ہے جس کی تلاش کے لئے اتنا بڑا انعام رکھا گیا ہے۔ (۱۲۱)

غارِ ثور میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تین دن رات (۲۷/۲۸ تا ۳۰ صفر ۱۳ نبوی ۱ھ/۹ تا ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء) قیام فرمایا، اور چوتھے روز یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی/ ۱ھ/پیر ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء کو مدینہ طیبہ کے لئے سفر ہجرت کا آغاز فرمایا (۱۲۲)۔ مکہ مکرمہ مولد و وطن تھا ۵۳ سال کا طویل عرصہ اس مطلبی و ہاشمی نے اس کی آغوش میں گزارا تھا، جس کا اظہار حسرت و یاس ان الفاظ میں ہوا

کہ ''اے مکہ تو مجھے تمام دنیا سے زیادہ عزیز تھا لیکن تیرے بیٹے (باشندے) مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔'' (۱۲۳) چار رکنی قافلہ روانہ ہوا۔ (۱۲۴) (میر کارواں، اپنے جد امجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی سنت ہجرت کے مقلد اور قائد سفر، محمد رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کی معیت میں ہم نفس وہمراہ تھے، عبداللہ بن اریقط طویل پیچیدہ وشوار گزار، کا دلیل وراہ نما اور عامر بن فہیرہ مولیٰ ابی بکر دورانِ سفر خدمت کے لئے مستعد) راور منزل بہ منزل پوری رفتار سے سفر کرتا ہوا (ایک ہفتہ بعد) پیر ۸ر ربیع الاوّل ۱ھ مطابق ۲۰ر ستمبر ۶۲۲ء کو قبا پہنچا، ور جمعہ ۱۲ر ربیع الاوّل ر۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کو بالآخر اپنی منزل مدینہ منورہ پہنچ کر اختتام پذیر ہوا۔ (۱۲۵)

سفرِ ہجرت، اس کے مضمرات وتفصیلات پر گفتگو اور منازل سفر کا بیان ہمارے موضوع سے براہ راست مربوط ومتعلق نہیں، البتہ اس طویل وعظیم سفر کے دوران بعض ایسے واقعات کی نشاندہی (ان واقعات کی ترتیب وقوع اور ان کی تقدیم سے بھی بحث مطلوب نہیں) ضرور کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے اصل موضوع یعنی عداوتِ قریش اور دعوتِ نبوی کے حوالہ سے اہم اور قابل غور ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ام معبد بنت کعب الخزاعیہ کے خیمے پر سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر اور مختصر قیام میں ہی اس معجزے کا ظہور کہ مہمان نواز ام معبد کے خیمہ میں موجود نحیف ونزار بکری خلاف توقع دودھ دینے لگی اور حضور کے دستِ مبارک سے مس ہوتے ہی اس کے تھن دودھ سے لبریز ہو گئے یہاں تک کہ تمام ارکان قافلۂ نبوی نے ہی سیر ہو کر دودھ نہیں پیا بلکہ ام معبد کے گھر والوں کے لئے بھی بچ گیا۔ اس پر مستزاد سراپائے اقدس کی جلوہ سامانیاں اور چہرۂ مبارک کی تابانیاں خود ام معبد کو حیران کر گئیں اور شام ڈھلے جب اس کا شوہر خیمے میں آیا اور دودھ کی فراوانی دیکھی تو حیران رہ گیا یہ پوچھنے پر مجبور ہو گیا کہ ام معبد یہ دودھ پیالہ بھر کے یہ کب کہاں سے آیا (۱۲۶) چنانچہ ام معبد نے بڑے فخر وانبساط سے کہا کہ یہ سب اس مبارک ہستی کا کمال ہے جو یہاں آیا اور پھر چلا گیا۔ ابو معبد یہ سن کر خود بھی جذباتی ہو گیا کہنے لگا او ہو! یہ تو وہی ''صاحب قریش'' معلوم ہوتا ہے، جس کی تلاش میں قریش سرگرداں ہیں (۱۲۷) اس کے بعد ام معبد نے اس سراپائے جمال کے بیان میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہائے ہیں، وہ غالباً ادب سیرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے خوبصورت تعارف شمار ہوتا ہے۔ خیمۂ ام معبد پر سرکار رسالت پناہ کی لمحاتی آمد و رخصت ہی ان لوگوں کے قلب ماہیت کا سبب بن گئی، چنانچہ وہ دونوں ہجرت کر کے آں حضور کی خدمت میں حاضر بھی ہوئے، اسلام بھی قبول کیا (۱۲۸) اور توسیع دعوت نبوی کا حصہ بن گئے۔

۲۔ ابن سعد کے مطابق قدید کے بعد قافلۂ نبوی آگے چلا تو اثنائے راہ میں قریش مکہ کے مشتہر

انعام کے لالچ میں سرشار، نیزہ بردار، اپنے فرس صبارفتار کے ساتھ سراقہ بن مالک بن جعشم کو اپنے تعاقب میں پایا (۱۲۹)۔ مگر جب بھی وہ نادان کو کبۂ نبوی عالی شان کے قریب آنے کی کوشش کرتا، اس کو ٹھوکر لگتی اور گھوڑے کی ٹانگیں زمین میں دھنس جاتیں۔ بالآخر ناکام ونامراد ہوکر حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کناں ہوا کہ میں نے دیکھ لیا، میں عاجز ہوا، آپ کی خیر، جان کی امان عطا فرما دیجئے۔ اس نے خود اعتراف کیا میں قریش کے انعام کا طلبگار ہوکر اس حرکت پر اتر آیا تھا۔ (۱۳۰) آپ ﷺ کی فراخدلی دیکھئے کہ خوشنودئ قریش کے متمنی کافر کو بھی معاف کرتے ہوئے امان عطا کردی، عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر ''امان نامہ'' بطور سند لکھ کر حوالے کردیا۔ پھر آقائے رسالت کا کرم بالائے کرم یہ ہوا کہ سراقہ کے واپس مڑنے سے پہلے اسے اس پیشین گوئی سے بھی سرفراز فرمایا کہ ''سراقہ اس وقت تیری کیا شان ہوگی جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے شاہی کنگن پہنائے جائیں گے (سراقہ احد کے بعد مسلمان ہوا اور خلافت فاروقی مین فتح مدائین کے بعد اس پیشگوئی کا مصداق بنا جب حضرت عمرؓ نے اس کو بلا کر کسریٰ کے کنگن اس کے ہاتھوں میں پہنائے)۔ اس کا مطلب ایک تو یہ ہوا کہ عداوت قریش کے اثرات راہِ ہجرت میں ابھی تک حائل ہورہے تھے اور دوسرے یہ کہ سراقہ کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ آخرکار صلی اللہ علیہ وسلم قریش پر غالب آکر رہیں گے اور ایک نہ ایک دن آپ ﷺ کو اقتدار ضرور حاصل ہوگا اسی لئے امان نامے کی استدعا اس کی پیش بینی کی آئینہ دار تھی کہ آپ مخالف قوتوں کو شکست دے کر غالب آجائیں گے تو اسے تحفظ حاصل ہوسکے گا۔ یہ گویا یقین نہیں عین الیقین تھا۔ ہم یہاں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ واقعۂ سراقہ کے حوالے سے گویا قریش کی طرف سے رسول الثقلین نبی الحرمین پر بالواسطہ وار کیا گیا۔ اگر خدانخواستہ وہ نیزہ بردار شہسوار سراقہ اپنے خطرناک ارادوں میں کامیاب ہوجاتا تو قریش کے لئے اس سے زیادہ مسرت وشادمانی کا لمحہ کوئی اور نہ ہوتا۔

۳۔ سفر ہجرت کی اگلی منزلوں میں، قریش کے اعلان کردہ انعام کے لالچ میں، ایک اور سورما بریدہ اسلمی ستر آدمیوں کے دستہ کے ساتھ، سدراہ بننے کے لئے قافلۂ نبوی کے سامنے آگیا، یہ بھی گویا قریش مکہ کے اثرات کا مظہر تھا۔ بریدہ اور اسکے ساتھی اب تک شاید اپنی ذات کے اندھیروں میں تھے اب جو اچانک اپنے سامنے آفتاب نبوت ورسالت کو ضوفشاں پایا، اسکے کلام کی بلاغت نظام کو سنا تو نگاہیں خیرہ ہوگئیں، سب کے سب چشم زدن میں دامانِ رسالت میں آگرے کہاں قریش کہاں ان کے انعام کے حذف ریزے ایمان کا نشہ چڑھ چکا تھا نعرۂ مستانہ بلند کیا اور بقول مولانا قاضی سلیمان منصور پوری بریدہ نے اپنی (سفید) پگڑی نیزہ پر باندھی تو سفید پھریرا لہرانے لگا، جسے لہراتا ہوا وہ اس اعلان کے ساتھ قافلۂ

نبوی کے آگے آگے چلنے لگا کہ امن کا بادشاہ، صلح کا حامی، دنیا کو انصاف وعدالت سے بھر پور کرنے والا تشریف لا رہا ہے۔ توسیع دعوتِ نبوی کا یہ خوشگوار منظر تھا۔ (۱۳۱)

۴۔ قافلۂ نبوی آگے بڑھتے بڑھتے قبیلۂ اسلم کی حدود میں داخل ہو گیا تو میر کارواں رسول اللہ الی العالمین نے اپنے یار غار اور ردیف حضرت ابو بکر سے فرمایا کہ ہم سلامتی تک آ گئے ہیں (۱۳۲)۔ سفر ہجرت کے پس منظر میں یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ قافلۂ نبویؐ قریش کی دسترس سے نکل چکا ہے، ان کی دست برد سے محفوظ اور تمام خطرات سے دور ہو گیا ہے۔ امن وسلامتی کی یہ ضمانت اس علاقے میں دی جا رہی تھی جہاں اسلم قبیلہ آباد تھا اور ابھی اپنے آبائی دین پر ہی تھا۔ وادئ رکوبہ کے ویرانے میں مسافروں کو لوٹنے والے چور اچکے ''مہانان'' اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا۔ اسلم قبیلہ والوں کو بھی پہلے سے علم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے یثرب کے لئے روانہ ہو چکے ہیں اور قریش نے آپ کو گرفتار یا قتل کرنے والوں کے لئے بھاری انعام مقرر کر رکھا ہے۔ قبیلہ کے سردار اوس بن حجر اسلمی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر ملی تو وہ خود حضور کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اپنے غلام مسعود کو حکم دیا کہ وہ قبیلے کے علاقے میں حضور کے ساتھ رہے اور وادئ رکوبہ کے مختصر راستے سے حضورؐ کے قافلے کو یثرب کی طرف لے جائے۔ مسعود اونٹ پر سوار ہو گیا اور آگے آگے چلنے لگا۔ اسلم قبیلہ کی حدود ختم ہو گئی تو مسعود نے حضور ﷺ سے اجازت چاہی کہ وہ دوسرے قبیلے کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا، حضورؐ نے اجازت دے دی۔ اس سے آگے آتش فشاں کے سیاہ ٹھنڈے لاوے کے ٹیلے تھے جن کی دوسری طرف قبا کی ہری بھری وادی تھی۔ سورج دوسری منزل میں داخل ہو چکا تھا گرمی بہت شدید تھی، حضورؐ کا قافلہ ان پہاڑوں میں بھی چلتا رہا۔ سیاہ پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تو قافلۂ نبوی خوبصورت وادی قبا میں داخل ہوا تو سورج نصف النہار سے نیچے آ گیا تھا۔ قبا میں شمع رسالت کے پروانے قافلۂ نبوی کی آمد کا بہت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ (۱۳۳)

اسناد، حواشی، حوالے

۱۔ گزشتہ مقالے میں اس غلط فہمی کا ازالہ کر کے (کہ مکی دور میں آنحضور پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت کم تھی جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا) یہ صراحت کر دی گئی تھی کہ نبوت کے ابتدائی تین سالوں میں (جسے عام مورخین اور سیرت نگار خفیہ دور یا خاموش تبلیغ کا زمانہ قرار دیتے ہیں) ایمان لانے والے (السابقون الاولون) خواتین وحضرات کی تعداد (مولانا عبدالرؤف دانا پوری اور مولانا مودودی کی فہرستوں کے

مطابق) کم از کم ۱۳۴ (سے زیادہ) تھی۔ جبکہ ایک جدید العہد مصنف و مولف نے ''دعوت کے پہلے تین سال میں اسلام لانے والے مرد، خواتین، بچے سب کا شمار کر کے مکہ میں اسلام لانے والے حضرات کی کل تعداد ۲۰۵ اور مکے سے باہر اسلام لانے والے ۶۵ حضرات کو شامل کر کے کل تعداد ۲۷۰ لکھی ہے۔ نیز واقعات و دلائل کے حوالے سے تصریح کی ہے کہ ''دعوت کبھی خفیہ نہیں تھی''۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ڈوگر محمد رفیق، الامین صلی اللہ علیہ وسلم۔ دیدوشد پبلشرز۔ لاہور ۲۰۰۶ء ج ۴ صفحہ ۴۷ تا ۷۹)۔

۲۔ ہجرت حبشہ کے اسباب واقعات اور نتائج و ثمرات ایک الگ موضوع ہے، یہاں اہل ایمان کی عددی کثرت کا اشارہ جدید مؤلف سیرت محمد رفیق ڈوگر کی مرتبہ فہارس کی رو سے دوسری بار حبشہ ہجرت کرنے والے کل افراد ۱۲۲ جب کہ حبشہ پہنچنے والے (۱۲۱) تھے جس میں، بالغ مرد (۹۵) خواتین (۲۳)، کنیزیں (۱) نابالغ مرد، بچے (۳) شامل تھے۔ علاوہ ازیں ہجرت کے بعد مکے میں رہ جانے والے حضرات کی دی گئی فہرست کے مطابق کل تعداد ۸۳ تھی۔ (دیکھئے الامین ج ۴ صفحہ ۱۴۳ تا ۱۵۴)

۳۔ رحمۃ للعالمین: ج ۱، ص ۸۵

۴۔ واٹ: محمد ایٹ مکہ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان بمع جدید، ۱۹۷۹ء: باب ششم، ص ۱۲۷

۵۔ ڈاکٹر زکریا بشیر (Dr Zakaria Bashir:The Makkan Crucible) شیار اسلامک فاونڈیشن۔ لندن U.K. طبع جدید، ۱۹۹۱ء: باب ہشتم، ص ۱۸۳

۶۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے گھر میں ام المومنین حضرت خدیجہ سیدہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہونے والی چھ اولادوں میں حضرت قاسم، سیدہ زینب، حضرت عبداللہ، سیدہ رقیہ سیدہ ام کلثوم اور سیدہ فاطمہ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما وعنہن میں سے مولود اوّل حضرت قاسمؓ تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابو القاسم ان ہی کے نام پر ہے۔ جن کا کم سنی میں انتقال قبل بعثت نبویؐ مکہ مکرمہ میں ہی ہو گیا تھا۔ دوسرے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ تھے۔ جن کا لقب طیب و طاہر ہے جو حضرت زینبؓ کے بعد مکہ معظمہ میں بعثت نبوت کے بعد پیدا ہوئے اور عام الحزن ۱۰ نبوی میں رحلت فرمائی۔ ان ہی کی وفات پر سورۂ کوثر کا نزول ہوا تھا۔ حضرت مولانا عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر فتح العزیز ترجمہ اردو مطبوعہ کتب خانہ رحیمہ دیو بند مطبوعہ ۱۳۷۳ھ میں سورۃ الکوثر کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ ''اس سورت کے نازل ہونے کا سبب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہؓ سے دو صاحب زادے تھے قاسم اور عبداللہ کہ ملقب تھے طیب اور طاہر کے ساتھ اور دونوں صاحب زادے بچپن میں پے در پے گزر گئے تو کافر بطور طعن کے کہنے لگے کہ پیغمبر ابتر ہے یعنی نسل اس کی منقطع ہوگئی''۔ آگے لکھتے ہیں۔ ''اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر مبارک کی تسلی اور تشفی کے واسطے یہ سورت نازل فرمائی'' (ص ۱۴۵) تفسیر حقانی کے مطابق ''جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو فرزندوں کا انتقال ہوگیا تو عاص بن وائل سہمی وغیرہ کفار نے آپس میں یہ کہا تھا کہ یہ ابتر یعنی اوت نپوت ہے حق سجانہ اپنے جیب کی طرف سے جواب دیتا ہے کہ دراصل وہی اوت نپوت ہیں (تفسیر حقانی ج ۴ ص ۲۵۵) حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنی تفسیر (تفسیر مظہری۔ ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۶۱ء) میں سورۂ کوثر کے تحت مندرجہ بالا تفصیل کی تائیدی روایات نقل کرنے کے باوجود سورت کے مدنی ہونے کو ترجیح دی ہے اور اس لحاظ سے کفار کے طعن کا مصداق آنحضور کے تیسرے صاحب زادے حضرت ابراہیمؓ کو قرار دیا ہے۔ (ص ۵۴۷ تا ص ۵۵۱) لیکن تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے ان کے موقف کی تائید نہیں ہوتی۔ حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی نے (رفیع الشان مترجم قرآن عظیم، ترجمہ از اعلیٰ حضرت مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹیڈ کراچی) اپنے تفسیری حاشیہ میں شانِ نزول کے تحت یہ لکھا ہے کہ ''جب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند حضرت قاسم کا وصال ہوا تو کفار نے آپ کو ابتر یعنی منقطع النسل کہا اور یہ کہا کہ اب ان کی نسل نہیں رہی ان کے بعد اب ان کا ذکر بھی نہ رہے گا۔ اس پر سورۂ کریمہ نازل ہوئی (ص ۸۷۷) نیز یہ بھی لکھا ہے کہ سورۃ الکوثر جمہور کے نزدیک مدنیہ ہے (ایضاً) حالانکہ دونوں باتیں جمہور کے نزدیک قابل ترجیح نہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ سورۃ الکوثر مکی ہے اور ۱۰ نبوی میں حضرت عبداللہ کے انتقال کے بعد نازل ہوئی۔

۷۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچنے والا ہر رنج والم کفار قریش کے لئے باعث مسرت ہوتا تھا۔ وہ تین سالہ معاشی ومعاشرتی مقاطعہ جس کے تحت بنو ہاشم اور بنو مطلب کے پورے پورے خاندان اور گھرانے مصائب کا شکار رہے ایک طرح سے اضافی، نمائشی، برائے بیت تھا، اس مقاطعہ کا اصل مقصد ومدعا تو یہی تھا کہ خاندان والے گھبرا کر اور پریشان ہو کر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے حوالے کرنے پر رضامند ہو جائیں گے۔ یعنی اصل نشانہ تو ذاتِ محمدی تھی۔ شعب ابی طالب سے بھوک سے بچوں کے رونے اور بلکنے کی آوازیں بلند ہوتی تھیں تو کفار خوش ہوتے تھے اور قریشی لطف اٹھاتے تھے۔ مقاطعہ کا خاتمہ خود قریش کب چاہتے تھے از روئے شرائط وہ ویسے بھی غیر معینہ مدت کے لئے تھا۔ ختم ہوا تو دشمنان دین کو دلی رنج ہوا۔ لیکن جناب ابوطالب کی وفات گویا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی نقصان تھا لیکن قریش دل ہی دل میں خوش کہ حضورؐ کو ان کے دست تظلم سے بچانے والا ہٹ گیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وصال مبارک نقصان در نقصان تھا لیکن قریش کے لئے باعث مسرت کہ پہلے پورے خاندان اور گھرانے کا سربراہ رخصت ہوا تھا اب براہِ راست گھر ویران ہو گیا، حضور تنہا، دو بچیاں (سیدہ ام کلثوم اور سیدہ فاطمہ) کم سن اور اکیلی غم خوار مددگار کی ضرورت بڑھ گئی۔ اس کے بعد ہی صاحب زادے حضرت عبداللہؓ (طیب وطاہر) کی رحلت سے تو قریش کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ عاص بن وائل نے کہا ''ان (محمدؐ) کی نسل ختم ہو گئی اب وہ ابتر ہیں (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی) محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مکے کے سردار عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا ''اجی چھوڑو انہیں وہ تو ایک ابتر (جڑ کٹے) آدمی ہیں ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔ بچی وہ مر جائیں گے تو کوئی ان کا نام لینے والا نہ ہوگا تو اللہ نے سورہ الکوثر نازل فرمائی۔ (ابن کثیر۔ تفسیر ج ۷ ص ۳۸۶) ابن رسول حضرت عبداللہ کی وفات پر ابوجہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں اور حضور کے غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عقبہ بن ابی معیط نے کیا تھا۔ عطا کہتے ہیں کہ جب حضورؐ کے دوسرے صاحب زادے کا انتقال ہوا تو حضورؐ کا اپنا چچا ابولہب، دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور

ان کو یہ ''خوش خبری'' دی کہ: آج رات محمد لاولد ہو گئے۔ اس پر ہی سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ (ایضاً ص ۳۸۹۔ ۳۹۰) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: مودودی، تفہیم القرآن: ج ۶، ص ۴۸۸، ۴۹۱)

۸۔ ہیکل (اردو ترجمہ): ص ۲۸۸

۹۔ قاضی محمد سلیمان، سلمان منصور پوری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''اگر چہ ابو طالب کا سہارا جاتا رہا، اگر چہ خدیجہؓ جیسی بیوی جو مصیبتوں اور تکلیفوں میں نہایت غم گسار تھی جدا ہو گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اب زیادہ جوش سے وعظ کا کام شروع کر دیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں بعد نبی اللہ مکہ سے نکلے اور بیرونجات کو وعظ کے لئے تشریف لے گئے۔ نبی ﷺ کے ساتھ اس سفر میں زید بن حارثہؓ تھے مکہ اور طائف کے درمیان جتنے قبیلے تھے سب کو وعظ سناتے توحید کی منادی کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پا پیادہ طائف پہنچے'' (رحمۃ للعالمین: ج ۱ ص ۶۱)

۱۰۔ مثلاً المنجد الاعلام کے مطابق طائف مکہ مکرمہ کے جنوب مشرق میں واقع حجاز کا دوسرا بڑا شہر جو جبل غزوان کی بلندیوں پر آباد، ریاض، مکہ، زہران اور نجران کا نقطہ اتصال، اہل مکہ کے لئے 'سرمائی مقام' جہاں انگور، انار (اور دوسرے پھلوں) کی کاشت ہوتی تھی۔ (ص ۴۳۳) طائف جبل السراۃ کے سلسلہ پر آباد ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی ۵ ہزار فٹ۔ آب وہوا سرد اور خشک۔ عہد رسالت سے قبل طائف کا سب سے بڑا اور با اثر قبیلہ ثقیف تھا۔ طائف مکے کا باغ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ مکہ میں سارے پھل طائف سے ہی لائے جاتے تھے۔ موجودہ طائف سے ۲/۳ میل کے فاصلے پر جنوب مغرب کی طرف ایک چھوٹی سی بستی مثناۃ ہے یہ طائف کا ہی ایک حصہ سمجھی جاتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصل طائف یہیں آباد تھا یہاں دو چھوٹی سی مسجدیں بنی ہوئی ہیں ان میں سے ایک مسجد عداس اسی جگہ بنی ہے جہاں زخمی ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا تھا جہاں عتبہ شیبہ کے باغ میں نصرانی غلام عداس نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں انگور پیش کئے تھے۔ دوسری مسجد ابن عباس واقع ہے۔ ان دونوں مسجدوں کے درمیان وادی وج کہلاتی ہے۔ (رابع ندوی۔ جزیرۃ العرب مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۸۴ء ص ۲۵۹ تا ص ۲۶۲) ابن ہشام کے مطابق مسجد ابن عباس اس جگہ تعمیر ہوئی جہاں طائف کے محاصرے کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ تھا۔ وہیں حضرت زید بن ثابت مدفون ہیں۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ ج ۱۲ ص ۳۹۶) علاوہ ازیں قبل اسلام سے ہی طائف اور مکہ توام (جڑواں) شہر ہیں۔ اگر ایک طرف مالدار اہل مکہ بالخصوص بنو امیہ طائف میں زمینیں خریدنے اور گرمیاں گزارنے جایا کرتے تھے تو طائف کے مستعد باشندے بھی تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں مکہ میں بود و باش رکھتے تھے (ص ۳۹۴) شروع میں ابن الظرب کا قبیلہ عدوان وہاں بستا تھا پھر ثقیف اور ایاد آئے۔ اور بعد ازاں بعض دیگر قبائل جو احلاف کے نام سے مشہور ہیں (ص ۳۹۵)

۱۱۔ الانعام: ۹۲

۱۲۔ الشعراء: ۲۱۴

۱۳۔ الحجر:۹۴

۱۴۔ واٹ۔محمد ایٹ مکہ۔ص ۱۳۸

۱۵۔ پورے قرآن میں قریتین کا لفظ ایک ہی مرتبہ یعنی سورۃ الزخرف (آیت ۳۱) میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے۔ اور اہل لغت نے اس کی تصریح کی ہے کہ قریش جب بھی القریتین کہتے تو اس سے مراد مکہ اور طائف کی دونوں بستیاں ہی ہوتیں (پرویز۔لغات القرآن ص ۱۳۵۷ بحوالہ محیط المحیط)۔

۱۶۔ علامہ بیضاوی نے الزخرف کی آیت ۳۱ کے سیاق وسباق کو سامنے رکھتے ہوئے مکی صورت حال کی وضاحت کردی ہے کہ حتی جاء هم الحق" یہاں تک کہ حق آ گیا" میں حق سے مراد ہے دعوت توحید یا قرآن۔ اور رسول مبین سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اپنی رسالت حقہ کے اظہار کے لئے معجزات اور توحید کی تشریح اور آیات و دلائل سے کام لیا تا کہ ان کو ان کی غفلت پر متنبہ کیا جائے۔مشرکوں کی نہ صرف یہ کہ شرارتیں بڑھ گئیں بلکہ ان کے شرک وکفر میں حق سے بغض وعداوت بھی شامل ہوگئی اور اس کی بے عزتی بھی۔اس لئے انھوں نے قرآن کو سحر اور جادو قرار دیا اور ان کی گستاخی اور بے باکی اس حد تک بڑھ گئی کہ اس کا صریحاً انکار کیا اور رسول کو بھی بہ نظر حقارت دیکھا اور کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں (کے اشراف یعنی قریش مکہ اور طائف) کے کسی سردار پر نازل کیوں نہیں کیا گیا قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ۔ جو جاہ ومال میں مکہ کے ولید بن المغیرہ کی طرح اور طائف کے عروہ بن مسعود الثقفی کی طرح ہو۔کیوں کہ نبوت ورسالت عظیم منصب ہے،اس لئے چاہئے کہ عظیم آدمی ہی رونق بخشے۔اور وہ یہ نہ جانتے تھے کہ نبوت ورسالت کا رتبہ عظیم اور مرتبہ روحانی ہے جو صرف اس عظمت نفس کا متقاضی ہے جو فضائل وکمالات قدسیہ سے آراستہ ہو نہ کہ خس وخاشاک دنیا سے آلودہ۔(ملاحظہ ہو: البیضاوی۔ناصر الدین ابی الخیر عبداللہ بن عمر۔(۷۹۱ھ) انوار التنزیل واسرار التاویل۔الطبع الاولی۔مصطفی البابی الحلبی۔ ۱۹۳۸ء مصر ج ۲ ص ۲۹۱)

۱۷۔ ملاحظہ ہو۔اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۱۲ ص ۳۹۴۔واٹ لکھتا ہے۔مکے کے مالداروں کی زمینیں طائف میں تھیں۔اور انھیں وہ گرمائی مقام (Snmmer resort) کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے۔ خصوصاً بنو ہاشم اور بنو عبد شمس (بنو امیہ) سے طائف والوں کے گہرے تعلقات تھے۔اور بنو مخزوم کے بنو ثقیف سے مالیاتی معاملات چلتے رہتے تھے (واٹ ص ۱۳۸) وہ مزید لکھتا ہے" بہر حال تعلقات تمام تر یک طرفہ نہیں تھے کیونکہ طائف کے ایک حلیف الاخنس بن شریق مکہ میں بنو الزہرہ کا مرکزی قائد رہا تھا (ایضاً ص ۱۳۹)

۱۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ج ۱۲، ص ۳۹۵

۱۹۔ واٹ: ص ۱۳۸، ۱۳۹

۲۰۔ طائف اور مکہ مکرمہ کے درمیان مماثلت ومقاربت کی مختلف صورتوں میں سے یہ بھی قابل ذکر ہے کہ طائف کے بنو ثقیف نے اسی رویہ کا اظہار کیا جو مکہ کرمہ میں قریش نے کیا تھا۔دونوں کی آنحضور ﷺ کی

رشتہ داری، دونوں طبقہ وامراسے، دونوں کے لئے دعوتِ توحید نا قابل قبول، دونوں کو اپنی دولت وثروت پر ناز، اور دونوں کے یہاں یہ خام خیالی کہ منصب نبوت کا استحقاق صرف امراء ورؤسا کو حاصل ہے جس کا اظہار ان کے اس قول میں ہے جو سورۂ زخرف (آیت ۳۱) میں نقل کیا گیا۔ قریش کے عام لوگوں کے بجائے مخالفت کی آواز حقیقی چچا ابو طالب نے اٹھائی اور دعوت عشیرہ میں بھی خاندان کے تمام افراد نے (ماسوائے حضرت علیؓ) دعوت حق کو قبول نہیں کیا، طائف کے بھی امراء ورؤسا مثلاً عروہ بن مسعود، حبیب بن عمرو، کنانہ بن عبد عمرو اور ابن عبد یالیل وغیرہ نے رشتہ داری کے باوجود دعوت نبوی کو قبول نہیں کیا۔ گویا انکار واستراد حق کے معاملہ میں بھی قریش و بنوثقیف کا یک ساں تھا یعنی مکہ اور طائف میں مماثلت و مشابہت کا اظہار تاریخی واقعہ ہے۔ جو قابل تعجب نہیں البتہ اس پر مستزاد سرداران طائف کی بداخلاقی تھی کہ عرب کی روایات مہمان نوازی کی بھی پرواہ نہیں کی اور تواضع تو درکنار انھوں نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں قیام فرمائیں بلکہ یہی چاہا کہ آپ وہ سرزمین جلد سے جلد چھوڑ دیں۔

۲۱۔ ڈاکٹر زکریا (The Mekkan Gucible): ص ۱۸۲

۲۲۔ محمد ایٹ مکہ: ص ۱۳۹

۲۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: محمد رفیق ڈوگر۔ الامین۔ ج ۱ ص ۴۷۔۴۴۶ مصنف نے مقاصد سفر طائف کے سلسلہ میں مفید بحث کی ہے اور مختلف آراء کا محاکمہ بھی کیا ہے۔

۲۴۔ رحمۃ للعالمین: ج ۱، ص ۶۱ تا ۶۳

۲۵۔ محمد رفیق ڈوگر، الامین: ص ۴۴۷

۲۶۔ ضیاء النبی ج ۲ ص ۱۴۱ ابن سعد کا بیان ہے: **فاقام بالطائف عشرہ ایام لایدع احداً من اشرافھم الا جارئہ و کلمہ** ابن سعد ج ۲ ص ۲۱

۲۷۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد لیٰسین مظہر صدیقی نے لکھا ہے کہ مکہ اور قریش کے مالدار تاجروں اور بڑے قبائلی سرداروں میں سے بیشتر کے ''اموال'' جائیدادیں طائف میں تھیں (ص ۲۰) نیز عباس بن عبد المطلب اور دوسرے اہل خاندان کی زرعی آراضی اور جائیدادیں طائف میں تھیں (ص ۲۱) اسی طرح عبد المطلب کو ان کے والد کی جائیداد و آراضی بھی ملی۔ اپنے والد کی تمام ریاست و دولت کے مالک بنے۔ ایک جائیداد، گھریلو رہائشی مکان (رکح) اور اس سے متصل میدان وافتادہ آراضی بھی اس میں شامل ''ارکاح'' بھی تھی (ص ۱۹) بحوالہ طبری حلبی ابن اثیر وغیرہ۔

۲۸۔ تاریخ یعقوبی کے مطابق **عرض رسول اللہ نفسہ علی القبائل وخروجہ الی الطائف فعمد لثقیف بالطائف فوجد ثلاثۃ نفرا خوہ ھم یومئذ سادۃ لثقیف وھم..... فعرض علیھم نفسہ وشکا الیھم وتھزوا بہ وافشوا فی قومھم ماقالوہ لہ وتعدوا صفین لہ مفین فلما مر رسول اللہ رجموہ بالحجارۃ حتی ادموا** (یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب۔ تاریخ الیعقوبی۔ دار صادر بیروت ج ۲ ص ۳۶)

۲۹۔ طائف کے اوباشوں کمینوں کی ٹولی (rabble) حضور اقدسؐ پر سنگباری کرتی ہوئی (شہر سے) باہر نکال کر جہاں سے واپس گئی وہاں کفار ان مکہ عتبہ اور شیبہ بن ربیعہ کا باغ (حائط) تھا۔ آنحضورؐ نے ذرا ستانے کے لئے اس جگہ کا ارادہ فرمایا جہاں انگور کی بیل کا سایہ تھا (مغمد الی ظل حبلۃ من عنب/ابن کثیر۔ السیرۃ ج ۲ص ۱۵۰) وہاں آپ تشریف فرما ہوئے۔ عتبہ شیبہ آپ کا وہاں پہنچنا اور حال دیکھ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں رحم کا جذبہ ابھر آیا اور انھوں نے (فی الفور) اپنے نصرانی غلام عداس کو حکم دیا کہ (ان حضرات کو) انگور طبق میں سجا کر پیش کرو۔ فلما رآہ ابنار ربیعہ عتبۃ و شیبۃ ومالقی تحرکت لہ رحمھما فرعوا غلاماً..... (ایضاً ص ۱۵۰) اور یہ تفصیل عربی اردو اکثر تصانیف میں موجود ہے کہ نصرانی غلام عداس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے متاثر ہو کر آپ کے ہاتھ پاؤں اور سر کو بوسہ دے کر اپنے آقاؤں (عتبہ و شیبہ) کے سامنے تصدیق و رسالت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''آج اس شخص سے بہتر روئے زمین پر کوئی بھی نہیں۔ (ابن اثیر کے مطابق یا سیدی مافی الارض شئ خیر من ھذا لقدا خبر نی بامر ما یعلمہ الا نبـــی ۔ ایضاً ص ۱۵۱/تاریخ یعقوبی نے عداس کے بارے میں لکھا ہے۔ فوجھہ الی رسول اللہ فلما سمع کلامہ اسلم۔ یعقوبی ج ۲ص ۳۶)

۳۰۔ ابن کثیر نے دعا کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں: اللھم الیك اشکو ضعف قوتی وھوانی علی الناس، یا ارحم الراحمین انت رب المستضعفین وانت ربی الیٰ من تکلنی، الیٰ بعید یتجھمنی ام الی عدو ملکتہ امری؟ ان لم یکن بك غضب علی فلا ابالی ولکن عافیتك ھی اوسع لی. اعوذ بنور وجھك الذی اشرقت لہ الظلمات وصلح علیہ امر الدینا و الآ خرۃ من ان تنزل بی غضبك او تحل علی سخطك لك العتبی حتی ترضی لاحول ولا قوۃالا بك السیرۃ النبویۃ ۔ (ج ۲ص ۱۵۰) ''اے اللہ اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں۔ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے؟ کیا بیگانہ ترش رو کے یا اس دشمن کے جو میرے کام پر قابو رکھتا ہے لیکن مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں کیونکہ تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور کی پناہ چاہتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تیری ناراضی مجھ پر وارد ہو۔ مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے''۔

۳۱۔ صحیحین میں روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ یہ پوچھا تھا کہ: کیا یوم احد سے بھی زیادہ سخت وقت آپؐ پر آیا تھا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا تھا کہ اس سے بھی زیادہ سخت وقت (طائف کی) گھاٹی میں اس وقت پیش آیا تھا جب کہ میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یالیل بن عبد کلال (وغیرہ) پر پیش کیا تھا اور جو میں چاہتا تھا اس کا انھوں نے (مثبت) جواب نہ دیا (ایضاً ص ۱۵۲)

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ ایضاً ص ۵۳ ارجو ان یخرج الله من اصلابهم من یعبد الله لایشرك به شیئا.

۳۴۔ ابن سعد کے الفاظ ہیں: من الطائف راجعا الیٰ مکه .....فلما نزل نخلة.....واقام نخلة اياماً (ج ا ص ۲۱۲) شوقی ابوخلیل نے اطلس السیرۃ النبویۃ (دارالفکر۔ دمشق ۲۰۰۲ء) میں مکہ وطائف کے درمیان وہ تاریخی راستہ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر فرمایا تھا ایک نقشہ کی صورت میں دیا ہے (ص ۶۷) لیکن اس میں نخلہ کا مقام نہیں دکھایا ہے۔ البتہ مولانا مودودیؒ نے سورۃ الاحقاف (آیت ۲۹) کے تحت حاشیے میں لکھا ہے کہ جنوں کی پہلی حاضری کا یہ واقعہ جس کا اس آیت میں ذکر ہے بطن نخلہ میں پیش آیا تھا ج ۴ ص ۶۱۸۔ نیز آگے لکھا ہے: ''یہ مقام جہاں یہ واقعہ پیش آیا یا تو الزیمۃ تھا یا السیل الکبیر کیونکہ یہ دونوں مقام وادی نخلہ میں واقع ہیں دونوں جگہ پانی اور سرسبزی موجود ہے اور طائف سے آنے والوں کو اگر اس وادی میں پڑاؤ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ انہی دونوں میں سے کسی جگہ ٹھہر سکتے ہیں۔ ایضاً ص ۶۱۹

۳۵۔ اس واقعہ کا ذکر اور حوالہ سورۃ الاحقاف کی آیت ۲۹ میں موجود ہے۔ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ O تفصیل کے لئے دیکھئے (حاشیہ نمبر ۳۳ ج ۴ ص ۱۹۔ ۶۱۸)۔ حاشیہ ۳۵ کے تحت مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ ''معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ (اس پہلے واقعہ حاضری جن کے) بعد جنوں کے پے در پے وفود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے لگے۔ اور آپ سے ان کی رودر رو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس بارے میں جو روایات کتب حدیث میں منقول ہوئی ہیں ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں کم از کم چھ وفد آئے تھے۔ (تفہیم القرآن ج ۴ ص ۶۱۹)

۳۶۔ سورۃ الزخرف کی آیت (۳۱) میں کفار ومشرکین (مکہ) کا جو قول نقل کیا گیا کہ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں شہروں (مکہ اور طائف) کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔ اور جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے۔ اس کے تسلسل میں اگلی آیت (۳۲) میں دو جگہ لفظ ''رحمت'' وارد ہوا ہے۔ اولاً رحمت سے مراد اللہ کی رحمت عام ہے جس میں سے ہر ایک (شخص) کو کچھ نہ کچھ (حصہ) ملتا رہتا ہے (گزر بسر کے ذرائع، وسائل معاش وغیرہ) لیکن ثانیاً رب کی رحمت (ورحمت ربک وخیر مما یجمعون/۳۲) سے مراد (بقول مولانا مودودیؒ) اس کی رحمت خاص یعنی نبوت (محمدی) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم (کفار ومشرکین مکہ وطائف) اپنے جن رئیسوں (ولید بن المغیرہ، عروہ بن مسعود الثقفی وغیرہ) کو ان کی دولت ووجاہت اور مشیخت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو وہ اس دولت (نبوت ورسالت) کے قابل (مقابل) نہیں ہے جو محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے یہ دولت (نبوت ورسالت) اس دولت (اموال اولاد مویشی وغیرہ) سے بدرجہا اعلیٰ درجہ کی ہے اور اس کے لئے موزونیت کا معیار (تمہارے معیار سے مختلف) کچھ اور ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: تفہیم القرآن ج ۴ ص ۵۳۷ نیز تفسیر الجلالین ذیل بکتاب لباب النقول فی اسباب النزول۔ المطبعۃ الھاشمیہ

دمشق ۱۳۸۵ھ۔ص۶۴۹)

۳۷۔ ابن سعد: ج ۱ ص ۲۱۱۔ جناب علی محمد خانصاحب مرحوم نے اپنی کتاب ''تقویم عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم'' (کراچی ۲۰۰۷ء) میں جو تقابلی جدول ترتیب دی ہے اس کے اعتبار سے ۲۷رشوال ۱۰ نبوی یا ۳ ق ھ کو جمعرات تھی جبکہ تقویمی تقابل میں یہ ۵رجون ۶۲۰ء ۲۷ررمضان مکی خریفی ۲۷رربیع الاول مکی ربیعی کے مساوی تھا۔ (دیکھئے جدول نمبر ۹۰)

۳۸۔ ایضاً۔ طائف سے مکہ کرمہ واپسی کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر وہ روایات نقل کی جاتی ہیں جن کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی جوار مطعم بن عدی کے سائے میں (خود آپؐ کی خواہش و درخواست کے بعد؛ ادخل فی جوارک؟ فقال نعم (ابن سعد ج ۲ ص ۲۱۲) جبکہ اخنس بن شریق اور سہیل بن عمرو مطعم سے پہلے ہی طلب جوار کے لئے آپ سے معذرت کر چکے تھے۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۳) ہوئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے طلب جوار (وہ بھی ایک کافر سے) کا مسئلہ محل نظر ہے۔ اور کئی پہلوؤں سے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ یہاں حاشیہ میں اس کا مفصل جائزہ ممکن نہیں۔ ہمارے نزدیک طلب جوار (کی خواہش رردرخواست)(i) مقام رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے لگا نہیں کھاتی (ii) آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود انتہائی شجاع، بہادر، ڈرخوف بزدلی سے مبرا، ہمت و حوصلہ والے تھے آپ نے مکہ چھوڑا تھا نہ اس کی سکونت ترک کی تھی، نہ آپ کو نکالا گیا نہ کسی خوف سازش کے تحت خود نکلے۔ آپ نے صرف بغرض تبلیغ (مضافات مکہ میں) طائف کا سفر اختیار فرمایا تھا (iii) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کے مستقل سکونت گزار تھے، آپ کا ایک گھر (بیت خدیجہؓ) حرم کعبہ سے بالکل قریب موجود تھا جہاں آپ اپنی زوجہ محترمہ (حضرت سودہؓ) اور بچوں (سیداتؓ) کے ساتھ سکونت رکھتے تھے سفر طائف کی روانگی (کے وقت) بچوں کو حضرت سودہؓ کی نگرانی میں (جنہیں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد کاشانۂ نبوی میں آئے ہوئے ہفتہ عشرہ ہی ہوا تھا) چھوڑ کر سفر طائف پر روانہ ہوئے تھے۔ (iv) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی تعلق خاندان بنو ہاشم سے تھا (جناب ابو طالب کے بعد ابولہب سردار بنا، تو زعم سرداری میں بڑا پن دکھایا حالانکہ اس کی سرکار رسالت سے دشمنی تھی اور آئندہ بھی رہی) اور اپنے بھتیجے سے کہنے لگا کہ جو کچھ تم ابو طالب کے زمانہ میں کرتے تھے بلا کھٹکے کرتے رہو (یا محمد امض لما اردت وما کنت صانعاً اذ کان ابو طالب حیا فاصنعہ۔ لا واللات لا یوصل الیک حتی اموت۔ ابن سعد ج ۲ ص ۲۱۱) غیرت و عصبیت قومی کے تحت ہی کہا تھا بلکہ یہ خود قریش کے نزدیک قابل تعریف صلہ رحمی کا تقاضا تھا (قد احسنت واجملت ووصلت الرحم۔ ایضاً) بعد میں ابو جہل اور عقبہ بن ابی معیط کے بھڑکانے کے باوجود ابولہب نے آپؐ کے حق میں جوار بنو ہاشم کے ختم کئے جانے کا اعلان نہیں کیا۔ (v) کیا مکہ کے باشندوں کو شہر سے باہر نکلنے یا کہیں کا سفر اختیار کرنے کے لئے طلب جوار کی حاجت ہوتی تھی؟ اور (تجارت یا تعلیم وغیرہ) کے لئے سفر کر کے واپس اپنے اہل وعیال تک پہنچنے کے لئے کسی کی پناہ میں آنا ضروری ہوتا تھا؟ کیا اس کی کوئی اور مثال پائی جاتی ہے؟ آپؐ اپنی مرضی سے بغرض دعوت و تبلیغ (مکہ سے متصل علاقے، طائف میں اتنے ہی فاصلہ پر جتنا آج کل مکہ اور جدہ کے

درمیان ہے) گئے تھے اس لئے اپنی مرضی سے اپنے گھر بار اہل وعیال کے درمیان واپس پہنچنے میں کیا امر مانع ہوسکتا تھا؟ (vi) بطن نخلہ سے مکہ کے لئے روانگی ہوئی تو آقائے رسالت پناہ سے حضرت زیدؓ نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ آپ مکہ میں کیسے داخل ہوں گے (**کیف تدخل علیھم یعنی قریشاً وھم اخر جوك؟** ابن سعد ۲۱۲) یہ خلاف واقعہ تھا کہ قریش نے آپ کو مکہ سے نکال دیا تھا۔ (وھم اخر جوک) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے اطمینان قلب سے جواب ارشاد فرمایا تھا: کہ اللہ خود ہی کوئی راستہ پیدا کردیگا۔ اپنے دین کا وہ خود حامی وناصر ہے اور اپنے نبی کو غالب کرنے والا ہے (ابن سعد ایضاً) گویا فراست نبوی کفار ومشرکین کی کسی ممکنہ شر انگیزی کے باوجود غلبہ دین اور نصرت پیغمبری کو دیکھ رہی تھی۔ (vii) آپ کی حفاظت ونصرت کا وعدہ خود اللہ رب العالمین نے فرمایا تھا: **و اللہ یعصمك من الناس** (المائدہ: ۶۷، نیز المومن: ۵۱) پھر جوار کے لئے کسی اور طرف دیکھنے کا جواز نہ تھا۔ (ہذا ما عندی والعلم عند اللہ)

۳۹۔ رحمۃ للعالمین: ج ۱، ص ۶۳

۴۰۔ ابن سعد نے 'ذکر دعاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' قبائل العرب فی المواسم کے زیر عنوان ان قبائل کی فہرست دی ہے، جن تک آپؐ پہنچے، انہیں دعوت (توحید/اسلام) دی اور اپنے آپ کو پیش کیا (ج ۲: ۲۱۶)۔ بنو عامر بن صعصعہ، محارب بن خصفہ، فزارہ، غسان، مرہ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نضر، بنو البکار، کندہ، کلب، الحارث بن کعب، عذرہ، الحضارمہ، (وغیرہ) مگر ان میں سے کسی نے آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا (ایضاً ص ۱۷۔۲۱۶)۔

۴۱۔ رحمۃ للعالمین۔ ص ۶۳

۴۲۔ ایضاً ص ۶۴

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ ایضاً۔ **اقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ ما اقام یدعو القبائل الی اللہ و یعرض نفسہ علیھم کل سنۃ بمجنہ و عکاظہ و منی ان یوء وو ہ حتی یبلغ رسالۃ ربہ و لھم الجنۃ** (ج ۲ ص ۲۱۷) ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۸۔

۴۵۔ ایضاً ص ۱۷۶ مولانا شبلی علیہ الرحمۃ نے سیرت النبی میں اس واقعہ کا ذکر "انصار کے اسلام کی ابتدا ۱۰ نبوی" (ص ۵۴۲) کے زیر عنوان کیا ہے مگر نہ معلوم کیوں اسے رجب ۱۰ نبوی کا واقعہ لکھا ہے حالانکہ تمام مآخذ میں اسے ایام الحج/ ذی الحجہ/ بلکہ درحقیقت ایام تشریق/ میں شمار کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی تقریباً متفق علیہ ہے کہ وہ چھ حضرات بنوخزرج کے تھے (ستۃ نفر کلھم من الخزرج) مولانا شبلی کے یہاں بھی ان کی شناخت خزرج لکھی ہے تاہم ان کے اسمائے گرامی کے شمار میں پہلا ہی نام اوسی کے ابوالہیثم بن التیہان کا لکھا ہے (ج ۱ ص ۲۵۵)۔ ابن سعد نے بھی الستۃ من انصار کی تفصیل میں سعد بن زرارہ (بنی نجار) عوف بن الحارث (بنی نجار) رافع بن مالک (بنی زریق) قطبہ بن عامر (بنی سلمہ) عقبہ بن عامر (بنی حرام) اور جابر بن عبداللہ بن رئاب (بنی عبید بن عدی بن سلمہ) کے اسمائے گرامی دیئے ہیں (ص ۲۱۹) البتہ ایک

جگہ اوس کے ابوالہیثم بن التیہان بھی مذکور ہیں (ایضاً) ابن کثیر نے اس تصریح کے باوجود کہ (کلھم من الخزرج) ابن سعد کی متابعت کرتے ہوئے ۶ خزرجیوں کے علاوہ ایک اوس ابوالہیثم بن التیہان کو بھی شامل کیا ہے (ج ۲ ص ۷۷۔۱۷۶) جو خلاف واقعہ ہے۔ سیرت النبی کے حاشیہ میں مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ انصار میں سے ابتدائے اسلام اور بیعت ہائے عقبہ اولیٰ و ثانیہ (تینوں واقعے) ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آئے (شبلی ج ۱ ص ۲۵۵) حضرت ابوالہیثم بن التیہان بیعتِ عقبہ اولیٰ (۱۱ نبوی) میں شامل ہیں۔ ابن کثیر نے موسیٰ بن عقبہ کے حوالے سے زہری اور عروۃ بن الزبیر کی روایت میں نقل کی ہے جسمیں پہلے گروہ انصار میں ۸ حضرات کو شمار کیا گیا ہے (کانوا ثمانیہ) اس کی تفصیل میں معاذ بن عفرا، سعد بن زرارہ، رافع بن مالک، زکوان، عبادہ بن الصامت، یزید بن ثعلبہ، ابوالہیثم بن التیہان اور عویم بن ساعدہ کے اسمائے گرامی درج ہیں (ج ۲ ص ۷۸۔۱۷۷) حاشیہ سیرت النبی میں لکھا ہے کہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی (تھے) جو شروع شروع میں اسلام لائے۔ (حاشیہ ج ۱ ص ۲۵۵)۔

۴۶۔ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷۶۔

۴۷۔ ابن سعد ج ۲ ص ۲۱۸۔

۴۸۔ سیرت النبی (ج ۱ ص ۲۵۴) مولانا سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں کہ ''اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے ان کے واقعۂ قبول اسلام کا عنوان بیعتِ عقبۂ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلام انصار ہونا چاہئے اور دوسرے سال جبکہ گیارہ بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے ہیں یہ بیعت عقبۂ اولیٰ ہے (بحوالہ سیرت حلبیہ) حضرت عبادہ بن الصامت نے بصراحت فرمایا ہے کنا احد عشر فی العقبۃ الاولیٰ من العام المقبل (بحوالہ مستدرک) اس روایت میں حضرت عبادہؓ العام المقبل میں بیعت عقبۂ اولیٰ کا ہونا فرماتے ہیں اور اس میں گیارہ آدمیوں کے ہونے کی صراحت فرماتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے پہلے جو لوگ آکر اسلام قبول کر چکے تھے اس کا تعلق بیعت عقبۂ اولیٰ سے نہیں ہے۔ جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعت اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا عنوان دیتے ہیں یعنی ایک بیعت عقبۂ اولیٰ دوسری وہ بیعت عقبہ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں ۷۳ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے اور یہ تینوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آئے (ص ۲۵۵) اور ایک ہی جگہ، بقول مولانا شبلی ''عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد العقبہ ہے'' (ص ۲۵۴) خوش قسمتی سے راقم الحروف کو بھی اس مسجد البیعۃ کی زیارت کا شرف کئی بار حاصل ہوا ہے اور اس کی عکسی تصویر بھی اس کے پاس محفوظ ہے نیز ڈاکٹر شوقی بوخلیل نے اپنی کتاب اطلس السیرۃ النبویۃ میں بیعت ہائے عقبہ کی تفصیل اور مسجد البیعۃ فی العقبۃ کی تصویر (ص ۷۲، ۷۳) شامل کی ہے۔ اہلِ یثرب/اہل مدینہ کی عقبہ پر پہلی حاضری اور آنحضورؐ سے ملاقات ایام تشریق ۱۱/۱۲ ذی الحجہ ۳ نبوی میں ہوئی، جس کا تقویمی تطابق جمعرات/جمعہ ۱۷/۱۸ جولائی ۶۲۰ء قرار پاتا ہے (دیکھئے علی محمد خاں، تقویم عہد

نبوی ص ۹۰)

۴۹۔ مولانا محمد اجمل خاں صاحب نے اپنی کتاب ''سیرت قرآنیہ سیدنا رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم (بار دوم۔ الفصیل لاہور۔ ۲۰۰۱ء) کی چوتھی فصل (ترتیب نزولِ قران کا نقشہ) میں قبل ہجرت و بعد ہجرت نازل ہونے والی آیات وسورۃ کی جو تفصیلی فہرست (ص ۱۲۸ تا ۱۴۸) بیان کی ہے وہ ان کی تحقیق و تدقیق کا شاہکار ہے اور سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی رو سے بیان کرنے کی بہترین کوشش ہے البتہ پہلی مفصل کاوش ہونے کے سبب اپنے مخصوص زمانہ (۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۵ء) کے سیاسی سماجی حالات وافکار اور خود محترم مصنف کے اپنے مخصوص افکار کی آئینہ دار ہے۔ سورتوں سے ماخوذ خلاصہ ہائے مضامین اور بعض نتائج فکر سے اختلاف کے باوجود مطالعۂ قرآن کا انہماک، ندرت فکر، اور عملی انطباق کی کوششیں قابل تعریف ہیں اور اپنے بعد آنے والے محققین و مصنفین کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ان کے نزدیک مقاطعۂ قریش کے سہ سالہ مخصوص دور (یعنی محرم ۷ نبوی تا ذی الحجہ ۹ نبوی رشعب ابی طالب) میں قرآن کا جو حصہ نازل ہوا اس میں البقرہ (رکوع ۳۵)، سورۂ لقمان، ابراہیم، یوسف اور سورۃ القصص شامل ہیں (دیکھئے ص ۳۳ افصل ۴ المرسل) ان آیات وسورت میں پائی جانے والی تعلیمات دراصل بین السطور وہ روایات ہیں جو معاشرہ، اہل ایمان اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے حالات کی مطابقت میں لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔ مثلاً قصۂ لقمان کا مرکزی نکتہ اس ہدایت پر مبنی ہے کہ ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ (لقمان ۱۳) اللہ سے وابستگی ہی العروۃ الوثقیٰ ہے لقمان ۲۲) غرور نخوت، خود پسندی اور زمین پر اکڑ کر چلنا سخت ناپسندیدہ ہے (۱۸) آواز اور رفتار قدم دونوں میں اعتدال انسانی فضیلت کی دلیل ہے (لقمان ۱۸، ۱۹) آخرت کے بجائے دنیا کا دلدادہ ہونا سراسر گمراہی کا باعث ہے (ابراہیم ۳) کفار ومشرکین ہمیشہ سے رسولوں کے مخالف رہے اور انہیں اپنے وطن سے نکالنے پر آمادہ ہو گئے (ابراہیم ۱۳) خدا اپنے بندوں پر، جسے چاہے، نبوت کے احسان سے سرفراز فرما دیتا ہے (ابرہیم: ۱۱) صبر وتوکل کی تاکید اس دور کا اہم اصول ہے (وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ O (ایضاً ۱۲) کافروں نے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تم کو اپنے ملک سے نکال باہر کریں گے یا پھر ہماری آبائی مذہب میں لوٹ آؤ (ایضاً ۱۳) لیکن اللہ کی طرف سے یہ یقین دہانی اہل ایمان کو ثابت قدم رکھنے کی بڑی محرک تھی کہ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ O وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (ایضاً ۱۳، ۱۴) سورۂ یوسف میں تاریخی حوالہ سے قصہ (احسن القصص) کی تمام تفصیلات کا انطباق مکی حالات پر ہو رہا تھا۔ اور یہ سبق دے رہا تھا کہ مشکلات کا انجام غلبہ و تمکن کی صورت میں ہی ظاہر ہوگا اس لئے آنحضور اور اہل ایمان کو دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں وكذلك مكنا ليوسف (۵۶) علاوہ ازیں وہ وقت ضرور آئے گا جبکہ آپ کامیاں وکامران ہو کر (اپنے مولد ووطن مکہ) لوٹ کر آئیں گے (القصص ۸۵)۔

۵۰۔ سورۃ الکوثر کے نزول کے بارے میں اگرچہ اختلاف ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی ہے۔ لیکن جمہور کا قوی اور

قابل ترجیح موقف (تفسیر حقانی ج ۴ ص ۲۵۱) ہی ہے کہ یہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی نیز اس کی داخلی شہادت اور مضامین بھی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ معلوم نہیں مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے سورۂ کوثر کے حاشیہ میں یہ کیسے لکھ دیا کہ ''سورۃ الکوثر جمہور کے نزدیک مدنیہ ہے'' (ص ۸۷۷ مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور) شانِ نزول کے سلسلہ میں علامہ موصوف مولانا مراد آبادی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''جب سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرزند حضرت قاسم کا وصال ہوا تو کفار نے آپ کو ابتر یعنی منقطع النسل کہا اور یہ کہا کہ اب ان کی نسل نہیں رہی اور ان کے بعد ان کا ذکر بھی نہ رہے گا یہ سب چرچا ختم ہو جائے گا اس پر سورۃ کریمہ نازل ہوئی (ایضاً ص ۸۷۷ حاشیہ مراد آبادی) یہ بھی سہو اور خلاف واقعہ ہے کیونکہ حضرت قاسم کا انتقال کم سنی میں قبل بعثت ہی ہو گیا تھا، چنانچہ (نزول قرآن سے پہلے ہی) ان کا انتقال سورہ کوثر کے نزول کا حوالہ نہیں بن سکتا۔ البتہ یہ زمانہ بعد نبوت مکی دور سے تعلق رکھتا ہے جبکہ عام الحزن (۱۰ نبوی) میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صاحب زادے جناب عبداللہ کی وفات پر کفار قریش کو طعنہ زنی کا موقع مل گیا۔ علامہ ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ جب ابن رسول (حضرت عبداللہ) کا وصال ہوا تو ابولہب مشرکین مکہ کے پاس دوڑا دوڑا یہ خبر سنانے کے لئے پہنچا کہ آج کی رات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ابتر (جڑ کٹا منقطع النسل) ہو گیا ہے۔ (ابن کثیر۔ تفسیر۔ ج ۷ ص ۳۹۰) ایک روایت کے مطابق یہ سورہ عاص بن وائل کے رد میں نازل ہوئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتا تھا اجی! انھیں چھوڑو! وہ تو ایک ابتر (جڑ کٹے) آدمی ہیں ان کی کوئی اولاد نرینہ نہیں مرجائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہ ہوگا، ایک روایت کے مطابق عقبہ بن ابی معیط بھی اسی قسم کی باتیں کہا کرتا تھا اور ابن عباس کی روایت ہے کہ ایک دفعہ کعب بن اشرف (یہودی سردار) مکہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا: **الا تری الیٰ ھذا الصبی المنبتر من قومہ یز عم انہ خیر منا ونحن اھل الحجیج واھل السقایۃ والسدانہ۔** (ایضاً ص ۳۸۹) سورہ کوثر کے نزول سے کفار قریش کی طعنہ زنی کا مسکت جواب بھی مہیا ہو گیا اور کوثر رخیر کثیر کے عنوان سے (انا اعطینک الکوثر) بے شمار انعامات الٰہی اور اخروی سرفرازی کی سند عطا فرما کر آپ کو پہنچے والے رنج والم کا بھی مداوا کر دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھرپور دلجوئی اور پاس خاطر بھی ہو گئی۔ بہر حال دیگر حالات، اور عالم یاس میں رب العلمین کی یہ خاطر مدارات داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے باعث تقویت تھا اور عزم نو کے ساتھ پیش قدمی پر آمادہ کرنے والا لمحہ تھا۔ جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابلاغ حق کے معاملہ میں اور زیادہ پرجوش ہو گئے۔

۵۱۔ حٰمٓ السجدہ ۶

۵۲۔ ایضاً: ۵

۵۳۔ ایضاً: ۲۶

۵۴۔ ایضاً: ۴۱

۵۵۔ ایضاً ۴۵

۵۶۔ الاحقاف:۲۹،۳۲

۵۷۔ حٰمٓ السجدہ، الجن، الحمد نصف اوّل اور الجاثیہ۔ مولانا اجمل خانصاحب نے شوال ۱۰ نبوی میں نازل ہونے والی آیات وسورۃ میں حٰمٓ السجدہ ۱/۱، الجن ۲/۲، الحمد نصف اول ۳/۳ اور الجاثیہ ۴/۴ کو شمار کیا ہے۔ ہمارے نزدیک سورہ جن کے بجائے (سورت کی داخلی شہادت کی بنا پر) سورۃ الاحقاف کو شمار کرنا چاہئے (جبکہ سورۃ الجن کے مضامین یہ بتا رہے ہیں کہ نخلہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت قرآن سن کر ایمان لانے اور اپنی قوم میں تبلیغ کرنے والے جنوں کے گروہ (جس کی ملاقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوئی تھی) کی کوششیں رنگ لائی تھیں اور جنوں کے طبقہ میں بھی دو گروہ (مومن وغیر مومن) پیدا ہو گئے تھے جس کا اعتراف سورۃ الجن میں خود جنوں کی زبانی منقول ہے: وانا منا الصالحون و منادون ذلك كنا طرائق قددا (الجن ۱۱) نیز وانا منا المسلمون ومنا القاسطون (ایضاً ۱۴) الدکتور شوقی ابو خلیل نے اطلس السیرۃ النبویۃ میں (طائف ونخلہ کے حوالہ سے جو تصاویر اور نقشہ ص ۶۶، ص ۶۷ اور ص ۶۸ پر دیئے ہیں اسی سلسلہ میں) ص ۶۹ پر جو نقشہ دیا ہے اس میں جنوں کے اس گروہ کی (جو نخلہ رجوار مکہ المکرمہ میں آیا تھا) نشاندہی کی ہے کہ وہ نصیبین (الجزیرہ) سے (پرواز کر کے) آیا تھا۔ لیکن عام تاثر کے تحت حاشیہ میں حوالہ (سورۃ الاحقاف کے بجائے) سورۃ الجن کا دیا ہے۔

۵۸۔ مولانا اجمل احمد خان (سیدنا رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم) ص ۳۴۔۱۳۳

۵۹۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (الاحقاف ۳۵)

۶۰۔ آیات ۳ تا ۶ مفہوم

۶۱۔ واقعہ معراج نبوی کی تاریخ کے تعین میں ہم نے تقویم عہد نبوی مولفہ محمد علی خان (ص ۹۱) کو سامنے رکھا ہے جس میں موصوف مولف نے سن قبل ہجرت، مکی شمسی خریفی، مکی ربیعی اور مروج شمسی تقاریم کا تقابل پیش کر کے توقیتی تضادات کو رفع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مولانا شبلیؒ نے سیرت النبی ج ۲ واقعات سیرت کے تحت معراج کا ذکر نہیں کیا ہے (البتہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ج ۳ میں جو دلائل ومعجزات کے لئے وقف ہے بہت تفصیل سے اسراء یا معراج کے لفظی معنوی کے تمام پہلوؤں پر مفصل بحث کی ہے اور معراج کے اسرار اعلانات احکام بشارتیں اور انعامات پر لکھا ہے دیکھئے: سیرۃ النبی (مطبوعہ دینی کتب خانہ لاہور ۱۹۷۵ء ج ۳ ص ۳۴۵ تا ۴۱۹) مولانا قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے رحمۃ للعالمین میں معراج کے بارے میں لکھا ہے کہ "۲۷ رجب ۱۰ نبوت کو معراج ہوئی (ج ۱ ص ۶۵) جبکہ جدول واقعات عظیمہ متعلق سیرت نبویہؐ کے تحت نمبر شمار ۸ میں معراج وفرضیت نماز خمسہ کو ۲۷ رجب ۵۰ء نبوی لکھا ہے۔ البتہ سفر طائف کے بعد اور ابتدائے ایمان اہل مدینہ سے پہلے۔ (ملاحظہ ج ۲ ص ۳۶۵) مولانا اجمل خاں صاحب نے سیرت قرآنیہ سیدنا رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم میں اسراء (یا معراج) کے عنوان کے تحت خلاف حقیقت اسے ایک خواب قرار دیا ہے (دیکھئے ص ۷۰۔۳۶۹) جو صحیح نہیں ہے۔

۶۲۔ الاسراء:۶۰

۶۳۔ النجم:

۶۴۔ مزید تشریح کے لئے دیکھئے قاضی سلیمان منصور پوری ج ۱ ص ۶۸ (بحوالہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی ۱۰۵۱ھ مندرجہ شرح سفر سعادت ص ۳۶)۔

۶۵۔ مولانا اجمل خانصاحب نے فصل ۵ رسول اللہ الی العالمین محرم ۱۰ تا صفر ۱۳ نبوی کے تحت عموماً اور ذی قعدہ ۱۰ نبوی کے تحت خصوصاً (بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں سفر طائف سے واپسی تا ہجرت نبوی یعنی آخری دو سالوں میں قرآن کا جو حصہ نازل ہوا ان آیات و سور کی) جو فہرست مرتب کی ہے اس میں سات سورتیں شامل ہیں (الزخرف، النمل، بنی اسرائیل، ہود، یونس، النحل اور الانعام)۔ ان تمام سورتوں کا زمانہ نزول اور ان کے مضامین کا تاریخی تطابق واضح کرنا ایک الگ مقالہ کا متقاضی ہے۔ جہاں تک سورہ بنی اسرائیل (یا سورۃ الاسراء) کا تعلق ہے۔ اس کا نزول واقعۂ اسراء و معراج کی متابعت میں ہوا۔ اجمل خان صاحب نے تفصیلات کے بیان میں اس سورہ کو اسراء (یا معراج) کے عنوان برتبصرہ کے بعد (ص ۳۷۰) رکھا ہے مگر افسوس کے سورہ کا بیان واقعہ اسراء و معراج کے حوالہ سے خالی صرف پانچ جملوں پر مشتمل ہے۔ (ایضاً) ص ۳۷۱۔۳۷۰) البتہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی تفسیر، تفہیم القرآن (ج ۲ ص ۵۸۶) میں سورہ بنی اسرائیل کے زمانہ نزول، پس منظر، موضوع اور مضمون کی وضاحت تمہید و تعارف میں کر دی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ''یہ سورت معراج کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔ معراج کا واقعہ حدیث و سیرت کی اکثر روایات کے مطابق ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا اس لئے یہ سورت بھی انہی سورتوں میں سے ہے جو مکی دور کے آخری زمانہ میں نازل ہوئیں (ایضاً ص ۵۸۶) آگے لکھتے ہیں کہ ''تعلیم کے پہلو میں اخلاق اور تمدن کے وہ بڑے بڑے اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر زندگی کے نظام کو قائم کرنا دعوت محمدیؐ کے پیش نظر تھا۔ یہ گویا اسلام کا منشور تھا جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال پہلے اہل عرب کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس میں واضح طور پر بتایا گیا کہ یہ خاکہ ہے جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کی اور پھر پوری انسانیت کی زندگی کو تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ (ایضاً ص ۵۰۷) آگے چل کر سورہ کی تفسیر و تشریح میں (آیات ۲۲ تا ۳۹) مدینہ کی (آئندہ) اسلامی ریاست کا منشور یا ۱۴ وہ بڑے بڑے بنیادی اصول پیش کئے گئے ہیں جن پر اسلام پوری انسانی زندگی کے نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا منشور ہے جسے مکی دور کے خاتمہ اور آنے والے مدنی دور کے آغاز پر پیش کیا گیا۔ (ملاحظہ ہو ایضاً ص ۶۰۸ تا ص ۶۱۷) ایک جدید العہد مصنف محمد رفیق ڈوگر نے اپنی کتاب الامین (ج ۲ ص ۴۷۳ تا ص ۴۸۳) میں ''ضابطہ اخلاق'' کے زیر عنوان سورہ بنی اسرائیل کی محولہ بالا آیات کا مضمون اس تمہید کے بعد بیان کر دیا ہے کہ ''معراج کے فوراً ہی بعد اللہ نے مسلمانوں کی اس جماعت کی تربیت کے لئے ایک ضابطہ اخلاق بھی نازل فرما دیا اور اس ضابطہ کو دین کا حصہ قرار دے دیا (ص ۴۷۳) سورۃ الاسراء (بنی اسرائیل) کے ضمن میں علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بڑی تفصیل سے ''ذکر الاحادیث الواردہ فی الاسراء'' کے تحت تمام متعلقہ روایات کو جمع کر دیا ہے (دیکھئے ج ۴ ص ۲۳۸ تا ص ۲۸۰) اور لکھا ہے کہ واقعہ اسراء (کی روایات و

تفصیلات پر) تمام مسلمانوں کا اجماع ہے اور صرف زنادقہ اور ملحدوں نے ہی اس سے ان کار کیا ہے (ایضاً ص ۲۸۰)

۶۶۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں انصار کے جن بارہ آدمیوں نے بیعت کی وہ (اصطلاحاً) بیعۃ النساء تھی اور یہ ان پر جنگ جہاد (الحرب) فرض ہونے سے پہلے ہوئی تھی (ج ۲ ص ۷۳) اس بیعت میں شامل (ایک رکن حضرت عبادہ بن الصامت کے مطابق) اجتناب شرک، سرقہ بہتان وغیبت، زنا، قتل اولاد پر اور معروفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے بچنے کے اقرار پر بیعت ہوئی تھی (ج ۲، ص ۷۵، ۷۶) ابن سعد نے بھی انہی امور پر بیعت کا ذکر کیا ہے (فاسلمو او بایعوا علی بیعۃ النساء) (ج ۱ ص ۲۲۰)۔ رفیق ڈوگر صاحب نے بیعت کے مضمون میں دو باتیں اور شامل کر دی ہیں لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا ہے (ایک یہ کہ اللہ کے رسول کا حکم مانو گے خواہ خوشحال ہوں یا تنگ حال خواہ وہ حکم تمہیں گوارا ہو یا ناگوار محسوس ہو اور خواہ تم پر کسی اور کو ترجیح دی جائے۔ اور دوسرے حکومت کے معاملہ میں اہل حکومت سے نزاع نہیں کرو گے اگرچہ تم یہ سمجھتے ہو کہ حکومت ہمارا حق ہے نیز جہاں بھی اور جس حال میں بھی ہو، حق بات کرو گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرو گے)۔ الامین ج ۱ ص ۵۰۳ آگے چل کر مصنف نے خود ہی لکھا ہے کہ ''اب تک کبھی ''حکومت'' کا لفظ کسی عہد میں استعمال نہیں ہوا تھا'' نیز لکھتے ہیں ''اس مرحلہ پر رسول اللہ نے اس عہد کو بیعت کا قصہ کیوں بنایا؟ (ایضاً ج ۱ ص ۵۰۴) مصنف بیعت کو بیعت النساء کہنا بھی درست نہیں سمجھتے اور ''پہلی کو بیعت انقلاب سے موسوم کرتے ہیں (ایضاً ص ۵۰۵)

۶۷۔ ترجمہ اردو قاضی سلیمان منصور پوری۔ ج ۱ صفحہ ۲۷

۶۸۔ فان و فیتم فلکم الجنّۃ و ان غشیتم من ذالك شیعاً فامر کم الی اللہ عزّ و جل ان شاءَ عذب و ان شاء غفر۔ ابن ہشام (ج ۲ ص ۷۵)

۶۹۔ بیعت عقبہ اولیٰ میں اہل مدینہ سے جن باتوں سے اجتناب (شرک، سرقہ، زنا، قتل اولاد، وغیرہ) اور اطاعت رسول کے اقرار کا وعدہ لیا جا رہا تھا، وہ ٹھیک وہی باتیں ہیں جن کی تعلیم سورہ بنی اسرائیل/الاسراء (آیات ۲۲ و مابعد) میں دی گئی اور جو ان ۱۴ اصولوں میں شامل ہیں جن پر اخلاق وتمدن کی تعمیر مدینہ کی اسلامی ریاست میں کی جانی تھی۔

۷۰۔ مآخذ کی اطلاع کے مطابق ۱۰ نبوی میں اہل مدینہ کے خزرجی گروہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے پہلے بھی یثرب/مدینہ/سے آنے والے اکا دکا افراد دعوت نبویؐ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے رہے مثلاً (جنگ بعاث سے بھی پہلے) ایاس بن معاذ (ابن ہشام ج ۲ ص ۶۹) لیکن خزرجی گروہ کے چھ افراد سے آنحضرتؐ کی ملاقات کے بعد مدینہ میں اسلام کو تیز رفتار پذیرائی حاصل ہوئی، اور ان چھ حضرات کی کوششوں سے اسلام وہاں خوب پھیلا یہاں تک کہ اس بستی میں انصار/اوس وخزرج کے گھرانوں میں سے کوئی گھرانہ ایسا نہ بچا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی ذکر گرامی سے معمور نہ ہوا ہو۔ (ابن ہشام کے الفاظ میں: و دعوھم الی الاسلام ۔۔۔ فشافیھم فلم تبق دارہ من دار الانصار الا وفیھا

ذکر من رسول الله صلی الله علیه وسلم) دیکھئے ج ۲ ص ۷۳

۷۱۔ شبلی، سیرۃ النبی: ج ۱ ص ۲۵۶

۷۲۔ رحمۃ للعالمین: ج ۱ ص ۷۲

۷۳۔ ابن سعد: ج ۱ ص ۲۲۰

۷۴۔ الاعراف: ۱۵۸

۷۵۔ الاحقاف: ۲۹

۷۶۔ روم: ۵۲، ۵۳

۷۷۔ محمد اجمل خان۔ (ص ۱۳۳ تا ص ۱۳۵)

۷۸۔ روم: ۴۲

۷۹۔ ایضاً ۹

۸۰۔ ایضاً ۴۷

۸۱۔ یونس ۳، ۱

۸۲۔ عنکبوت ۱۸

۸۳۔ انعام ۳۳

۸۴۔ یونس ۱۰۸

۸۵۔ یونس ۹۔۱

۸۶۔ الروم: ۶۰

۸۷۔ عنکبوت ۵۶

۸۸۔ اس آیت کے مفہوم میں ایک مفسر کے مطابق ''یعنی دشمن تم کو ایسا کمزور نہ پائیں کہ ان کے شور و غوغا سے تم دب جاؤ یا ان کی بہتان و افترا پردازیوں کی مہم سے تم مرعوب ہو جاؤ یا ان کی پھبتیوں اور طعنوں اور تضحیک و استہزا سے تم پست ہمت ہو جاؤ یا ان کی دھمکیوں اور طاقت کے مظاہروں اور ظلم و ستم سے تم ڈر جاؤ یا ان کے دیئے ہوئے لالچوں سے تم پھسل جاؤ۔ (ملاحظہ ہو: مودودی: ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی۔ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔ ۱۹۹۲ء، ۱۰۳۹۔ حاشیہ ۱۶: ص ۱۰۳۹

۸۹۔ عنکبوت: ۶۹

۹۰۔ الانعام ۱۵۳

۹۱۔ ایضا: آیت ۸۸

۹۲۔ ایضا: ۱۶۱، ۱۶۴

۹۳۔ واٹ کہتا ہے کہ یہ بالکل واضح ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اہل مدینہ کے درمیان محتاط مذاکرات کا سلسلہ کافی عرصہ جاری رہا چنانچہ (حضرت) مصعبؓ کو مدینہ روانہ کرنا محض اس وجہ سے ہی نہیں تھا کہ

نومسلموں کو تعلیم دیں بلکہ یہ نکتہ بھی اس میں مضمر تھا کہ وہ (مصعبؓ) وہاں (مدینہ) کے حالات کا جائزہ لے کر مطلع کریں (اور اپنی رپورٹ پیش کریں) تفصیل کے لئے دیکھئے واٹ (محمد ایٹ مکہ) ص ۱۴۷۔۱۴۶

۹۴۔ بیعت ہائے عقبہ، خصوصاً بیعت عقبہ ثانیہ یا بیعت عقبہ کبیرہ کی اہمیت اور متعلقہ مباحث، نقبا کا تقرر وغیرہ کی تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے راقم الحروف کا مقالہ: عہد نبوی میں ریاست کا نشو وارتقاء۔ (مطبوعہ) نقوش لاہور۔ رسول نمبر۔ ج ۵ شمارہ نمبر ۱۳۰ دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۴۷ تا ص ۸۶)

۹۵۔ ابن ہشام ج ۲ ص ۸۵

۹۶۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال للنقباء: انتم علیٰ قومکم بما فیھم کفلاء ککفالة الحواریین لعیسیٰؑ بن مریم علیٰ قومی. یعنی المسلمین. قالوا: نعم (ایضاً ص ۸۸) نقباء کے تقرر پر واٹ کو کچھ پریشانی ہے۔ اس کے خیال میں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے کوئی کام کیا ہو (ص ۱۴۷) ان کے فرائض کا اظہار غالباً اس لئے زیادہ نمایاں نہیں ہوسکا کہ یہ ایک عبوری انتظام تھا تاوقتیکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم (چند ماہ بعد بحیثیت امام، پیشوا، سربراہِ مملکت) وہاں پہنچ کر تمام ریاستی انتظامات سنبھال لیں۔ واٹ کے بقول ''کچھ مغربی مصنفین کو یہ شبہ ہے کہ (بیعت عقبہ ثانیہ کی) کہانی میں ان کے کردار کو اس لئے شامل کیا گیا ہے تاکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی (حضرت) موسیٰ اور (حضرت) عیسیٰ (علیہم السلام) سے مماثلت و مشابہت ثابت کی جاسکے۔'' (ص ۱۴۷) وہ آگے رقمطراز ہے'' وہب کے بیان کے مطابق اہل مدینہ میں سے ایک نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ٹھیک انہی شرائط پر بیعت کی جس طرح نقبائے بنواسرائیل نے (حضرت) موسیٰ سے کی تھی اور ایک بیعت کنندہ نے ان شرائط پر کی جن پر حواریوں نے (حضرت) عیسیٰ ع ابن مریم سے بیعت کی تھی (۱۴۸۔۱۴۷) آگے چل کر واٹ خود ہی کہتا ہے کہ'' یہ شبہ بے بنیاد ہے نیز سابقہ مثالوں کی دانستہ نقل بھی نہیں۔ امکان یہی ہے کہ نقباء کو مدینہ میں تشکیل پانے والی نئی امۃ (نئی معاشرت) کے پرانے انتظامات کا حصہ بنایا گیا تھا جو بعد میں باقی نہ رہا (ص ۱۴۸)

۹۷۔ مولانا شبلیؒ۔ ج ۱ ص ۵۹۔۲۵۷

۹۸۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: واٹ (محمد ایٹ مکہ) ص ۱۴۱ تا ص ۱۴۹

۹۹۔ سورۂ یونس آیت ۴۷ رواٹ نے ۴۸ لکھی ہے جو صحیح نہیں

۱۰۰۔ محمد ایٹ مکہ ص ۱۴۳، ۱۴۴

۱۰۱۔ ایضاً

۱۰۲۔ بیعت عقبہ ثانیہ کی پوری روداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل مدینہ علی وجہ البصیرت یہ جانتے سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور انھیں امام و پیشوا بنا کر مدینہ بلانا عرب و عجم سے جنگ مول لینا ہے۔ اس لئے قریش سے دشمنی اور ان سے مقابلہ بیعت کا نتیجہ اور تقاضہ تھا۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ان کے ایک قائد حضرت براء بن معرورؓ نے بیعت کرتے وقت، حضور کا دست اقدس اپنے ہاتھوں میں لے کر جو کہا

تھا اس میں یہ بھی شامل تھا: فبا یعنا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنحن واللہ انبا الحروب واھل الحلقۃ ورثنا ھا کابراً عن کابر (ابن ہشام ج ۲ ص ۸۴) یارسول اللہ آپ ہم سے بیعت لے لیجئے۔ ہم لوگ تو خدا کی قسم جنگوں کی اولاد ہیں، اور اسلحہ سے کھیلنے والے (جنگ آزمودہ) لوگ ہیں اور یہ چیز باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہے۔ ان کے وفد کے ایک اور رکن حضرت عباس بن عبادۃ بن نھلۃ الانصاری نے اپنے ہی لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ تمہیں کیا معلوم ہے کہ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا، انھوں نے پھر کہا انکم تبایعونہ علی حرب الاحمر والاسود من الناس (ایضاً ص ۸۸) تم لوگ اسود واحمر (تمام لوگوں) سے جنگ لڑنے پر بیعت کر رہے ہو۔ اسی قسم کے جذبات کا اظہار حضرت اسعد بن زرارہ اور (اُسی رات بیعت سے چند لمحوں پہلے ایمان لانے والے ابو جابر عبداللہ بن عمروؓ (ایضاً ص ۸۳) وغیرہ حضرات نے بھی کیا تھا۔ چنانچہ انصار کے نزدیک قریش سے جنگ ومخالفت تقاضائے ایمان واسلام اور ہر طرح متوقع تھی۔

۱۰۳۔ واٹ: صفحہ ۱۴۸

۱۰۴۔ ابن ہشام ج ۲ ص ۹۰

۱۰۵۔ ابن ہشام ج ۲ ص ۹۱۔۹۰۔ اجمل خاں صاحب نے بغیر سند کے لکھا ہے کہ ''ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ ابولہب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن تھا، وہاں چھپا ہوا ہے اور سب باتیں سن رہا ہے''۔ (ص ۳۷۴) آگے جاسوسوں کی شیطنت کا عنوان دے کر لکھا ہے کہ ''یہ سب باتیں ایک جاسوس ابولہب سن رہا تھا اور بلند آواز سے پکارا اے خیمے والو! تمہیں خبر بھی ہے کہ مذمم (یعنی محمد) اور بے دین صابی (یعنی مسلمان) تم سے جنگ کرنے والے ہیں (ص ۳۷۶) عباس انصاری نے یہ سنتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر حکم ہو تو ابھی ہم اپنی تلواروں کی روانی دکھادیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پر امن رہنے کی ہدایت کی اور حکم دیا کہ اپنے خیموں پر واپس چلے جاؤ۔ (ایضاً)

۱۰۶۔ ابن ہشام: ج ۲ صفحہ ۱۱۱

۱۰۷۔ واٹ یہ لکھنے کے بعد یہ معاہدہ (بیعت عقبہ ثانیہ) خفیہ تھا۔ اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے میں کوئی وقت ضائع نہیں کیا گیا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر لینا چاہتے تھے قبل اس کے کہ دشمنوں کو خبر ہو۔ اس لئے آپؐ نے اپنے متبعین کو مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جانے کا اشارہ کر دیا (ص ۱۴۹) پھر وہ یہ عجیب بات لکھتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کا مدینہ میں کوئی روشن مستقبل نہیں تھا۔ (مزید ۱۴۸)

۱۰۸۔ الاسراء ۸۰

۱۰۹۔ بن ہشام ج ۲ صفحہ نمبر ۱۱۱)

۱۱۰۔ اس کی مثالیں بہت ہیں، لیکن پہلی نمائندہ مثال (اول من ھاجر الی المدینۃ) حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد کی ہے جو ایک سال پہلے بھی یثرب گئے تھے وہ مہاجرین حبشہ میں بھی شامل تھے۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹے کو اونٹ

پر بٹھا کر ہجرت کرنے لگے تو تھوڑی ہی دور پر ان کے سسرالیوں (بنی مغیرہ) نے گھیر لیا اور کہا کہ ہم اپنی بیٹی کو تمہارے ساتھ نہیں جانے دیں گے تمہارا جہاں دل چاہے چلے جاؤ۔ حضرت ابوسلمہ اکیلے یثرب روانہ ہو گئے (بیوی اور بچے سے جدا ہو کر) ان کے اپنے خاندان والوں کو معلوم ہوا تو وہ بنی مغیرہ کے ہاں پہنچ گئے ''تم نے ہمارے خاندان کے آدمی سے اپنی لڑکی تو چھین لی ہے مگر ہم اپنے خاندان کا بچہ تمہارے پاس نہیں رہنے دیں گے وہ ام سلمہ سے ان کا معصوم بچہ چھین لے گئے'' چنانچہ اب حضرت ابوسلمہ یثرب میں تھے اکلوتا معصوم بچہ بنی مغیرہ والوں کے پاس ام سلمہؓ اکیلی خود خاندان والوں کی گرفت میں تھیں۔ آخر کار ایک چچازاد بھائی کی مہربانی سے بچہ واپس مل گیا تو ام سلمہ نے اپنا اونٹ لیا بیٹے کو آگے بٹھایا اور اکیلی یثرب روانہ ہو گئیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے۔ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۳۔۱۱۲ / پورے قصہ کے اختتام پر راوی یعنی ام سلمہؓ ام المومنین کا یہ قول اہم ہے کہ ہجرت کی راہ میں ابوسلمہ کے اہل وعیال سے زیادہ شاید کسی نے مصائب نہیں سہے اور عثمان بن طلحہ سے زیادہ مہربان شخص میں نے نہیں دیکھا۔ (ایضاً ص ۱۱۳) تاریخوں اور سنن کی مطابقت کے لئے عام طور پر علی محمد خاں کی تالیف تقویم عہد نبوی ﷺ پر اعتماد کیا گیا ہے۔

۱۱۱۔ ابن ہشام نے اجتماع الملاء من قریش تشاورھم فی الرم الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت ان کے اشراف قریش کی فہرست دی ہے اور بطور خاص شیخ نجدی کی صورت میں ابلیس کی موجودگی کا ذکر بھی گیا ہے۔ شرکاء میں عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، طعیمہ بن عدی، جبیر بن مطعم، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوالنجری، زمعۃ بن الاسود، حکیم بن حزام، ابوجہل بنیہ ومنبہ بن الحجاج، امیہ بن خلف وغیرہ شامل ہیں (ابن ہشام ج ۲ ص ۱۲۴۔۲۵)

۱۱۲۔ الانفال ۳۰

۱۱۳۔ سورۂ زخرف آیت ۷۹، ۸۰

۱۱۴۔ واٹ یہ لکھنے کے بعد کہ مسلمان مدینہ میں ایک نئی قسم کی کمیونٹی، نیا معاشرہ جنم دے رہے تھے۔ جس کی نظریاتی بنیاد ہونا ضروری تھی۔ ایک ایسا معاشرہ جو مذہب / دین / اسلام کی بنیاد پر استوار ہو نہ کہ رشتہ داری / خاندان کی بنیاد پر (ص ۱۴۹) پھر آگے ہجرت کے عنوان کے تحت یہ تصریح کرتا ہے کہ عروہ کی یہ تجویز / تبصرہ کہ مسلمانوں سے مظالم سے بچنے کے لئے ہجرت کی تاکید کی جائیگی۔ ہجرت سے پہلے مظالم کے نئے سلسلہ کا اندازہ نہیں ہوتا سوائے ابوسلمہ کے (ساتھ ہجرت کے وقت پیش آنے والا واقعہ) یا جو بدتمیزی یا بدسلوکی انھوں (قریش) نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابوبکر کے ساتھ روا رکھی۔ (ایضاً ص ۱۴۹)

۱۱۵۔ یٰسین ۷ تا ۱۰۔

۱۱۶۔ قرارداد ابوجہل کی پیش کردہ تھی۔ ابن ہشام کے یہاں ابوجہل کی پیش کردہ قرارداد کے الفاظ یہ ہیں: قال اری ان ناخذ من کل قبیلة فتی شابا جلیداً نسیباً وسیطاً فینا ثم تعطی کل فتی منهم سیفاً صارماً ثم یعمدوا الیه فیضر بوه بها ضر بة رجل واحد، فیقتلوه فنستریح منه اذا فعلوا ذلک تفرق دمة، فی القبائل جمیعاً فلم یقدر بنو عبد مناف علی حرب قومهم جمیعا

فرضوا منابا بالعقل فقلناه لهم (ابن ہشام ج۲ ص۱۲۹) ابو جہل کی اس تجویز اور عمل کے حوالہ سے ایک جدید العہد مصنف کا یہ تبصرہ بڑا معقول اور برمحل معلوم ہوتا ہے کہ ''اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ ابو جہل نے یہ تجویز کیا تھا کہ ہر قبیلہ سے ایک نوجوان لیا جائے لیکن اس متفقہ فیصلہ کے مطابق اس کام کے لئے جو افراد چنے گئے تھے اور جنھوں نے رسول اللہ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آپؐ کے گھر کا محاصرہ کیا تھا ان میں خود ابو جہل اور ابو لہب بھی شامل تھے اور یہ کم از کم دونوں کسی لحاظ سے بھی نوجوان نہیں تھے (ڈوگر۔ الامین۔ ج۱ ص۵۸۱) معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس کے نمائندہ تمام شرکا وہاں سے اٹھ کر کاشانہ نبوت کے گرد گھیرا ڈالنے آگئے اور عالی نسب تیز دست نمائندہ قبیلہ نوجوان کی شرط روبہ عمل نہ آسکی۔

۱۱۷۔ مولانا شبلی نے انعقاد اجلاس کی تاریخ بیان نہیں کی۔ مولانا سلمان منصور پوری نے محاصرہ کاشانہ نبوی ۲۷ر صفر ۱۳ نبوت روز پنجشنبہ ۱۲ر ستمبر ۶۲۱ء کا واقعہ لکھا ہے۔ جب کہ شمس سن ۶۲۲ء تھا چنانچہ یہ سہو ہے (رحمۃ للعالمین ج۱ ص۸۰) ہم نے علی محمد خان صاحب کی تالیف تقویم عہد نبوی کو سامنے رکھا ہے۔ (ویسے بھی تقویمی فرق میں ایک دن کی تقدیم تاخیر ممکن ہے۔

۱۱۸۔ ابن ہشام ج۲ ص۱۲۶

۱۱۹۔ چنانچہ سرراہ ایک گزرنے والے نے ان گھیرا ڈالنے والوں سے پوچھا کہ تم یہاں کس کا انتظار کررہے ہو وہ کہنے لگے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کا) تو وہ بولا تمہارا ستیاناس! وہ تو تم سب پر خاک ڈالتا ہوا کبھی کا نکل چکا۔ تم خود دیکھ لو تم میں سے ہر ایک کے سر پر خاک پڑی ہوگی انھوں نے دیکھا تو ایسا ہی تھا (ایضاً ص۱۲۷)

۱۲۰۔ ابن ہشام ج۲ صفحہ۱۳۴

۱۲۱۔ ڈوگر: الامین۔ ج۱، ص۵۶۴

۱۲۲۔ علی محمد خان۔ تقویم عہد نبوی۔ (ص۹۳)

۱۲۳۔ محمد اجمل خان (سیرت قرآنیہ) ص۳۸۸

۱۲۴۔ ابن ہشام ج۲ صفحہ۱۳۳

۱۲۵۔ علی محمد خان (تقویم عہد نبویؐ) ص۹۳

۱۲۶۔ ابن ہشام ج۲ ص۱۳۲ (حاشیہ)

۱۲۷۔ قال صفیہ یا ام معبد

۱۲۸۔ ابن سعد ج۲ ص۲۳۰

۱۲۹۔ ایضاً ص۲۳۲

۱۳۰۔ وکنت ارجوان اردہ علی قریشِ آخذ المائۃ الناقۃ، ابن ہشام ج۲ صفحہ۱۳۴

۱۳۱۔ قاضی سلیمان منصور پوری۔ رحمۃ للعالمین (ج۱ ص۸۵)

۱۳۲۔ یہ تفصیل رفیق ڈوگر کی کتاب الامین (ج۱ ص۵۷۶-۵۷۷) سے ماخوذ ہے۔

۱۳۳۔ ایضاً